# تحریفِ قرآن کی حقیقت

از افادات

سید العلماء السید علی نقی النقوی

مصباح القرآن ٹرسٹ

۱۰۔ گنگا رام بلڈنگ شاہراہِ قائدِاعظم ۔ لاہور

# تحریف قرآن کی حقیقت

از افادات

سید العلماء السید علی نقی النقوی

مصباح القرآن ٹرسٹ

۱۰- گنگا رام بلڈنگ شاہراہ قائداعظم - لاہور

نام کتاب: تحریفِ قرآن کی حقیقت
تالیف: علامہ سید علی نقی النقوی
کتابت: دارالکتابت حضرت کیلیانوالہ (گوجرانوالہ)
طبع اول: ۱۴۰۹ھ — ۱۹۸۹ء
ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ
مطبع: معراج پریس
ہدیہ: ۲۵/ روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر
۲۴- الفضل مارکیٹ، اُردو بازار — لاہور



# فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# عرض ناشر

قرآن مجید — کتاب الٰہی ہے اور اس کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داری خود خدائے توانا نے لے رکھی ہے۔ پھر یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ کئی ایک مسلمان راویوں، محدثوں اور مورخوں نے تحریف قرآن کی روایات بیان کی ہیں۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں میں تشکیک اور غیر مسلموں کی تعریض کا سامان فراہم کر دیا ہے۔

اگرچہ مکتب اہل بیتؑ کے ہادیان برحق — ائمہ اثنا عشر علیہم السلام اور بزرگ علمائے شیعہ نے قرآن کریم میں کسی بھی طرح کی کمی و بیشی واقع ہونے کی سختی سے تردید فرما دی ہے لیکن اس کے باوجود بعض علمائے اہل سنت اپنے گھر کی خبر لیے بغیر غیر مسلموں کی تعریضات سے آنکھیں بند کر کے شیعہ امامیہ کو تحریف قرآن کے قائل ہونے کا الزام دیئے چلے جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض سادہ لوح عوام ان علماء کی تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہو کر شیعہ مسلمانوں کو نہ صرف تحریف قرآن کے قائل — بلکہ منکر قرآن سمجھنے لگتے ہیں

اس صورت حال کے پیش نظر مکتب اہل بیتؑ کے مجاہد قلم و لسان، سید العلماء علامہ السید علی نقی النقوی مجتہد اعلی اللہ مقامہٗ نے کتاب ہذا — "تحریف قرآن کی حقیقت" — تالیف فرمائی جو بیک وقت مسلم و غیر مسلم معترضوں کو ساکت کر دینے والی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ امامیہ مشن لکھنو نے ۱۹۳۰ء میں شائع کی تھی۔ ہمیں اس کا مطبوعہ مسودہ راولپنڈی کے معروف قومی علمی ادارے — کتاب خانہ صفیہ سیالہ — نے برائے اشاعت مرحمت فرمایا ہے۔

چنانچہ ہم مؤلف علام کی بلند شخصیت، موضوع کی اہمیت اور کتاب کی افادیت کے عتبار سے اس کو خصوصی اہتمام کے ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ کر کے افرادِ ملت کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ محبانِ قرآن و اہلبیتؑ اس بلند پایہ کتاب کے شایانِ شان اس کی پذیرائی کریں گے۔

امیدوارِ تعاون
ڈائرکٹر
مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز لاہور





# تمہید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَاٰلِہِ الطَّاھِرِیۡنَ

موجودہ زمانہ میں اسلام پر مخالفین کے حملے ہو رہے ہیں اور وُہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہُوا ہے۔ عیسائی مشن جو دُنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہُوئے ہیں اور آریہ مشن جو خاص ہندوستان کے ہر بڑے اور چھوٹے مقام پر موجود ہیں، اُن کے کارخانہ سے روزانہ نئے نئے اعتراضات ڈھل کر نکلتے ہیں جن کا اگر جواب نہ دیا جائے تو کمزور اور بے ثبات عقیدہ کے اشخاص یقیناً اُن کی زد پر آ کر اسلامی عقائد سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مقدس ذات پر ایسے ایسے شرمناک الزامات لگا کے دُنیا کو باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے جو حق و صداقت کے لیے سمّ قاتل کا حُکم رکھتے ہیں۔

موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہُوئے ضرورت اس کی تھی کہ تمام مسلمان ہم آہنگ ہو کر مخالفین کے مقابلہ کے لیے ایک متحد محاذِ جنگ پیش کرتے اور اپنے قوٰی اور ذرائع کو مجتمع حیثیت سے اسلامی مشترکہ اصُول کی حمایت میں صَرف کرتے ہُوئے دُشمنانِ اسلام کے حملوں کا دفعیہ کرتے، لیکن افسوس ہے کہ بعض افراد جو خود مسلمانوں کے اندر افتراق و اختلافات کی خلیج کو وسیع کرنا اپنے لیے بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں ہر روز ایسے ایسے مسائل معرضِ بحث میں لانا ضروری سمجھتے ہیں جن سے خواہ مخواہ اسلامی شیرازہ منتشر اور اتحادِ اسلامی کی دیوار میں رخنہ پیدا ہو۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام کے لیے کچھ اصُول اساسی ہیں کہ اُنہی کے اعتقاد کا مجموعہ

اسلام کہا جاتا ہے اور ان میں تمام فرقِ اسلامیہ باوجود اپنے آپس کے اختلافات کے برابر کے شریک ہیں۔

الوہیت، رسالت، کتابِ منزل یعنی قرآنِ مجید اور روزِ قیامت یعنی معاد، فرقِ اسلامیہ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں وُہ اسی معنی سے ہے کہ مذکورۂ بالا اشیاء پر وُہ ایمان لائے ہُوئے ہیں اور اس کے بعد کسی جماعت کو دُوسری جماعت کے مقابلہ میں یہ حق نہیں ہے کہ وُہ اس کے ایمان کا اُن میں سے کسی شے کے متعلق انکار کرے۔

اور پھر جبکہ ایمان واعتقاد امرِ باطنی ہے جس کے ادراک تک حواسِ ظاہریہ کی دسترس نہیں اور انکار کرنے والا عالم الضمائر والخفیات درازہائے قلبی اور اسرارِ نہانی پر مطلع، نہیں ہے اور ایمان رکھنے والا اعلان کے ساتھ اپنے ایمان کا اظہار کر رہا ہے اور اس کے افعال و اعمال بھی اس کے عقیدہ کے ترجمان ہیں۔

اس کے بعد یہ افتراق انگیزی اور اختلاف ریزی نہیں تو کیا ہے کہ کسی جماعت پر اُس کے اعلان واظہار کے برخلاف یہ الزام عائد کیا جائے کہ تم قرآن پر ایمان نہیں رکھتے جس کا قدرتی جواب اس جماعت کی طرف سے یہ ہے کہ تم خود ایمان نہیں رکھتے۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ آپس کی لڑائی غیروں کی ہنسائی، فریقِ ثالث یعنی ایک آریہ یا عیسائی کو یہ رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہو گیا کہ ان میں سے کسی کا بھی ایمان قرآن پر مسلّم حیثیت نہیں رکھتا اور اس طرح خود قرآن کی مسلّمہ وقعت واعتبار میں شبہ پیدا کرنے کا موقع نکل آیا۔

کیا اسلام کی دوستی اور اس سے ہمدردی کا تقاضا یہی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر اسلام سے سچی محبت ہو تو لازم یہ ہے کہ اس قسم کے سوالات کو اُٹھا کر افتراق کا مظاہرہ نہ ہونے دو، بلکہ تمام فرقِ اسلامیہ کے اس متفقہ عقیدہ کو کہ "قرآن مجید وحیِ سماوی اور کتابِ ربّانی، منزل من اللہ رسول کا اعجاز ہے، اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور نہ اس میں ذرہ برابر باطل کا شائبہ ہے اور اس پر ایمان واعتقاد کامل تمام مسلمانوں کے اسلام کا جزوِ اعظم ہے" لے متفقہ ومتحدہ صورت پر باقی رہنے دو۔




مَیں نے نہ اس لیے قلم اٹھایا ہے کہ کسی کے ایمان بالقرآن کی نفی کروں اور نہ اس کو کوئی مفید خدمت اسلام کی سمجھتا ہوں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ مسئلہ تحریفِ قرآن پر جو اس قسم کے مباحث کا سنگِ بنیاد ہے تاریخ وحدیث ودرایت کی روشنی میں انتقادی نظر ڈالتے ہُوئے فریقین کے مذہبی روایات اور تاریخی مندرجات کی رُو سے قرآنِ مجید کے اعتبار واستناد پر ایک مکمل تبصرہ کروں۔

# قرآنِ مجید کی عظمت

## پیغمبرِ اسلام کی نبوت کا زندہ ثبوت

گذر گئے انبیائے سلف اور مُردہ ہو گئیں ان کی نبوتیں اس لیے کہ ان کی بنیاد ایسے دلائل پر تھی جو وقتی طور پر انصاف کی شرط سے منکرین کے سر تسلیم کو خم کرانے کے لیے کافی تھے لیکن اُن میں دوام واستمرار کا جوہر نہ تھا۔ ان میں اتنا دم نہ تھا کہ وُہ زمانہ کی سیلابی رفتار میں اپنے وجود کو محفوظ رکھ سکیں، وُہ ایک خاص وقت اور جزوِ زمانہ کے پابند تھے جو اُس وقت کے منقضی ہونے پر خود بھی رُخصت ہو گئے اور اپنے بعد کے لیے صرف افسانہ کی صورت پر اپنا تذکرہ چھوڑ گئے جو دس بیس برس تک اگر مشاہدہ کرنے والی جماعت کی موجودگی کے باعث تواتر کی حیثیت رکھنے کی وجہ سے ناقابلِ انکار بھی تھا تو اس سے زیادہ زمانہ گذرنے کے بعد اور خصوصًا دُوسری تیسری صدی میں تو وُہ مشکوک اور مشتبہ حکایات کا مجموعہ ہو گیا جن میں ناقلین کی کثرتِ سہو اور بھول چوک کی وجہ سے پیدا شدہ اختلافات نے اور زیادہ کمزوری پیدا کر کے ان کو توہم پرستیوں کا کرشمہ سمجھنے کے کافی وجوہ پیدا کر دیئے۔

مسلمانوں کے لیے قرآنِ مجید میں اگر ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ وغیرہ دیگر انبیاء کی نبوت اور اُن کے بعض معجزات کا تذکرہ نہ موجود ہوتا تو کبھی ان کو تسلیم کرنے کے وجوہ پائے نہ جاتے اور اسی لیے وُہ اشخاص جو اپنی اپنی قوم میں بڑے مرتبوں پر فائز کہے جاتے ہیں جیسے زردشت اور گشتاسپ اور ہندوستان کے قدیم راہنما ان کی نبوت کبھی وہم واحتمال کے دائرہ سے نکل کر

اعتقادی حدود میں داخل نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ان کی مقدسانہ زندگی کے متعلق جتنے بھی حیرت انگیز کرامات کی شہرت ان کی جماعت کے اندر ہو لیکن وُہ کسی غیر جانبدار شخص کو جو اُس جماعت سے تعلق نہ رکھتا ہو ان کی طرف جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ اُس شہرت میں خوش عقیدگی اور سادہ لوحی اور توہم پرستی کا عنصر بہت حد تک کارفرما سمجھا جا سکتا ہے۔

کریں نیاز فتحپوری معجزاتِ عیسٰی کا انکار، ہم اُن کے دعوائے اسلام کی بنا پر یہ کہہ کر تو چُپ کر دیں گے کہ تم مسلمان ہو اور قرآن مجید میں ان معجزات کا تذکرہ موجود ہے لہذا تمھیں انکار کا حق نہیں چنانچہ چھ برس پہلے میں نے ایک مبسوط مقالہ "اعجازِ عیسوی" کے عنوان سے "نگار" کے مذکورہ بالا خیالات ہی کی ردّ میں قلمبند کیا تھا جو الواعظ کی متعدد اشاعتوں میں مسلسل طور پر شائع ہُوا لیکن اُس مضمون میں جہاں تک دیکھا جائے یہی ہے کہ قرآنی اد آرے صاف طور پر اُن معجزات کا ثبوت پیش کر کے مدیر "نگار" نے اس کے خود ساختہ تاویلات کر کے جو دھاندلی کرنا چاہی ہے اُس کا پردہ فاش کیا گیا ہے، وُہ مضمون مسکت ضرور ہے اور اسی بنا پر "نگار" کو پھر اس پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہُوئی لیکن یہ اُسی وقت تک کہ جب تک بدقسمتی سے مدیر نگار اپنے تئیں مسلمان کہے جاتے ہیں اور اگر وُہ ذرا جُرأت کر کے یہ کہہ دیں کہ مَیں قرآن کی آیتوں کو نہیں مانتا تو پھر ان کی فتح اور ہماری شکست، ہم پھر معجزات عیسٰی کا کوئی ثبوت اُن کے سامنے پیش نہیں کر سکتے اس لیے کہ حربہ ہمارے ہاتھ میں ایک ہی تھا جس کو انھوں نے ہم سے چھین لیا۔ یہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کی خصوصیت ہے کہ حضرت کی نبوت دُنیا کے آخری دَور تک ہر وقت زندہ ہے، حضرت کی نبوت و رسالت کی بنیاد صرف اُن وقتی معجزات پر نہ تھی جو اس زمانہ میں موجود ہونے والے اشخاص ہی کے سرِ تسلیم کو خم کرا سکتے ہیں بلکہ حضرت کے دعوے کی بنیاد اُس قرآنِ مجید پر ہے جو پورے چودہ سو برس گزرنے کے بعد بھی اس وقت زندہ ہے اور دُنیا کو حق و صداقت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔





# قرآن مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے!

دُنیا تہی دست ہے جبکہ اس کے پاس قرآن کے مثل کوئی کتاب نہیں لیکن مسلمان قرآن کی بدولت اس خزانۂ عامرہ کے مالک ہیں جس کی نظیر صفحۂ روزگار میں مل نہیں سکتی۔

تباہ ہو جائیں سابقہ اسلامی سلطنتیں اور مٹ جائے اُن کا جاہ و جلال لیکن جب تک مسلمانوں کے ہاتھوں میں قرآن موجود ہے وُہ دُنیا کے اقوام میں سربلندی کے مالک ہیں، حقانیت و صداقت کا علم اُن کے سر پر لہراتا اور غیبی طاقت و جبروت کا پرچم اُن کے ساتھ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔

قرآن جس طرح اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے مشرکینِ عرب کے لیے معجزہ تھا جو اس قلمرو میں خداوندی کے مدعی تھے اُسی طرح وُہ اپنے حقائق و اسرار کی حیثیت سے بھی معجزہ ہے۔

اس کی آیتوں میں وُہ بیش بہا جوہر نظر آتے ہیں جو بڑے سے بڑے فلسفی کو اپنی حقانیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اُس میں علوم و فنون کے وُہ اسرار و دقائق مندرج ملتے ہیں جن کو سالہا سال کی تحقیقات کے بعد معلوم کرنا سرمایۂ افتخار سمجھا گیا ہے۔

اس میں ایسے اکتشافات کا بھی پتہ ہے جن سے دُنیا قرآن مجید نازل ہونے کے تیرہ سو برس بعد تک بھی بے خبر رہی اور ارباب تحقیق و جستجو کے ہاتھوں نے پردہ ہٹا کر ان حقائق کو سامنے پیش کر دیا ہے۔

پیش کریں مسلمان اور شوق سے پیش کریں اس قرآن کو تمام مذاہب عالم کے سامنے، بلند کریں آواز اور اس طرح کہ دُنیا کی وسیع فضا گونج اٹھے اور پھر دعوت دیں کہ تمام فلاسفۂ دُنیا، تمام علوم و فنون کے ماہر، تمام تمدن و اخلاق و علم النفس و سیاست و اجتماع اور مذاہب و ادیان کے راہنما اس کی ایک ایک سطر ایک ایک جملہ، ایک ایک حرف کو دیکھیں، درس لیں، پڑھیں اور اس میں غور کریں یقیناً غلط فریبی کے پردے جو آنکھوں پر پڑے ہیں اٹھ جائیں گے، قرآن کی حقانیت آفتاب نیم روز بن کر چمکے گی اور دُنیا کو اپنا حلقہ بگوش بنا لے گی۔

یہ ہے قرآن کہ جو مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ اور اسلام کا خزانۂ عامرہ ہے۔

## وحیٔ آسمانی کی طرف منسوب شدہ کتابوں پر نظر

وُہ کتابیں جو الہامی کہی جاتی ہیں اور وحیٔ آسمانی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اُن کے متعلق اگر خود اُن کے ماننے والوں کے محررات کی روشنی میں نظر کی جائے تو اُن کی تاریخ زندگی ایسے حوادث و انقلابات کا مجموعہ نظر آتی ہے جن کی بنا پر کسی صُورت سے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کے کسی حصّہ کسی جزو کا وجود بھی دُنیا میں باقی ہے اور یہ کہ جسے اب اُس کے متبعین سر اور آنکھوں پر رکھ رہے ہیں اور خدا کا کلام سمجھتے ہیں ان میں کوئی آدھا چوتھائی جملہ بھی اس حقیقی وحی سے عیناً مطابق ہے جو پیغمبروں پر نازل ہُوئی تھی۔

## توریت کی سرگذشت

توریت کہ جو یہود و نصاریٰ کی متفقہ کتاب اور اس لحاظ سے مخصوص اہمیت کی مالک ہے اس کی تاریخ عجب رُوح فرسا مصائب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک اس کی زندگی کو فنا کر دینے کی ضامن ہے۔

**پہلی مصیبت**

اس کے امانت دار اور حامل (بنی اسرائیل) کا بار بار دیانت موسویہ سے کنارہ کشی کر کے ارتداد اختیار کرنا اور تمام قوم کا من حیث المجموع بیک مرتبہ خدا پرستی کو ترک کر کے بُت پرستی شروع کر دینا جس کے نمونہ دو چار نہیں بلکہ دو تین صدی کے اندر دس بیس کی تعداد یا اس سے زیادہ تک پہنچتے ہیں۔

بھلا وُہ قوم کہ جو خود مُوسیٰؑ کی زندگی میں حقائق الٰہیہ سے اتنی بعید تھی کہ بات بات پر توحید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر شرک اختیار کر لی تھی وُہ موسیٰ کے بعد کب دیانت موسویہ پر قائم رہ سکتی تھی۔ چنانچہ ابھی موسیٰ کے وصی یوشع کے انتقال کو کچھ زیادہ عرصہ گذرنے نہ پایا تھا کہ بنی اسرائیل نے اپنے خدائے برحق کو چھوڑ کر دُوسرے خداؤں کی پرستش شروع کر دی اور اُن کو سجدہ کرنے لگے جس کی سزا میں خدا نے ایسے اقوام کو مسلط کیا جنھوں نے اُن





کو غارت اور اُن کے اموال کو برباد کیا اور اُن کو غلام و کنیز بنا کر فروخت کیا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً خدا مصلح پیدا کرتا رہتا تھا۔ لیکن اِدھر ایک مصلح کا انتقال ہوتا تھا اُدھر پوری قوم کی قوم کفر و شرک اختیار کر لیتی تھی۔ (سفر قضاۃ باب ۲ آیت ۱۱-۱۹)

بنی اسرائیل کا قیام کنعانیین و حتیین و اموریین وغیرہ کے درمیان ہُوا اور آپس میل جول بڑھا یہاں تک کہ اُن کی لڑکیوں کی شادی ان کے یہاں اور ان کی لڑکیوں کی شادی اُن کے یہاں ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اُن کے خداؤں کی پرستش کرنے لگے اور اپنے خدا کو بالکل بھُول کر بتوں کی پوجا پاٹ کرنے لگے جس کی پاداش میں خدا نے پوری قوم کو شان رشعتایم بادشاہِ آرام النہرین کی غلامی میں دے دیا۔ (باب ۳ آیت ۵-۸)

گذشتہ پاداش سے عاجز آ کر توبہ و انابت کی اور خدا نے اُن کو اُس غلامی سے نجات دی لیکن چالیس ہی برس گذرے تھے کہ پھر پوری قوم دین سے پلٹ گئی جس کی سزا میں خدا نے عجلون بادشاہِ موآب کو مسلط کیا اور اٹھارہ برس تک تمام بنی اسرائیل کو اس کی غلامی کرنا پڑی۔ (آیت ۱۲-۱۴)

اس کے بعد خدا نے رحم کھا کر نجات دی مگر اسی برس کے بعد پھر بنی اسرائیل نے شرارت شروع کر دی اور خدا نے یابین بادشاہِ کنعان کو مسلط کیا جس نے بنی اسرائیل کو ۲۰ برس تک سخت ترین تکلیفیں پہنچائیں۔ (باب ۴ آیت ۱-۳)

پھر چالیس برس صبر و سکون میں گذرے اور اُس کے بعد پانچویں مرتبہ بنی اسرائیل نے شرک اختیار کیا اور بُت پرستی شروع کی جس کی سزا میں سات برس بنی مدیان کی غلامی کرنا پڑی (باب ۶ آیت ۱)

چھٹی مرتبہ جدعون کے انتقال کے بعد بنی اسرائیل پھر موسوی دیانت سے پلٹ گئے اور بتوں کی پرستش کرنے لگے اور اُس خدا کو بالکل بھُول گئے جس نے ان کو چند مرتبہ ظالمین سے نجات دی تھی۔ (باب ۸ آیت ۳۳-۳۴)

ساتویں دفعہ اُس وقت جب یائیر جلعادی قاضی کا انتقال ہُوا تھا، بنی اسرائیل نے شرک اختیار کیا اور کثیر التعداد بتوں کی پرستش شروع کر دی اور خدا کی عبادت کو ترک

کردیا جس کی وجہ سے خدا نے ان کو فلسطینیوں کے ہاتھ بیچا اور اُنھوں نے اٹھارہ برس اتنی سختی سے حکومت کی کہ بنی اسرائیل کی ہڈیوں پسلیوں کو چوڑا کر دیا۔ (باب ۱۰ آیت ۶-۸)

پھر عبدون بن ہلیل فترتونی کی وفات کے بعد ان لوگوں نے اسی قسم کے افعال کا اعادہ کیا جس پر دوبارہ ان پر فلسطینیوں کو چالیس برس تک کے لیے مسلط کیا گیا۔

(باب ۱۴ آیت ۱)

مختصر یہ ہے کہ موسوی لوگ موسیٰ کی تعلیم کے خلاف دُوسرے اقوام سے میل جول بڑھا کر اُن کے اخلاق و عادات سے متاثر ہوتے اور ان کے بتوں کی پرستش کرکے شرک کو اختیار کرتے تھے اور اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو بتوں کی خاطر قربانی کرتے تھے جس کی بنا پر متعدد بار خدا کا غضب اُن پر نازل ہُوا اور ہر مرتبہ اُن پر ظالمین کو مسلط کیا جاتا تھا جو اُن کی انتہائی توہین و تذلیل کرتے تھے اور پھر ہر مرتبہ خدا نے توبہ و انابت کے بعد اُن کو نجات دی لیکن وُہ لوگ مستقل طور سے اس کی نافرمانی ہی کرتے رہے۔ (مزمور ۱۰۶ آیت ۳۴-۴۳)

جب سلیمان کا انتقال ہُوا اور مملکتِ بنی اسرائیل دو حصّوں میں منقسم ہوگئی، ایک جماعت نے جو یہودا و بنیامین کی نسل سے تھی رجبعام کو منتخب کیا اور باقی جتنے اسباط کی اولاد تھی، انھوں نے یربعام کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا، یربعام نے اُن کے لیے دو گوسالہ سونے کے تیار کرائے اور اعلان کیا کہ خدا یہی ہیں جن کی پرستش کرنا لازم ہے چنانچہ اُن کی پرستش جاری ہوگئی اور اُن کے اطراف و جوانب میں کاہنین نے ڈیرے ڈال دیئے اور ایک طویل عرصہ تک ان کی پرستش جاری رہی۔ (سفر ملوک اوّل باب ۱۲ آیت ۲۵-۳۳)

حد یہ تھی کہ اخاب کے زمانہ میں صنم کی طرف دعوت دینے والے چار سو پچاس نبی تھے اور مختلف ستونوں کے جن کی پرستش ہوتی تھی چار سو نبی تھے۔

(سفر ملوک اول باب ۱۸ آیت ۱۹)

یہ حالت ان لوگوں کی یوشع بن ایلہ کے عہدِ سلطنت تک قائم رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ہر سربلند ٹیلے کے اُوپر اور سرسبز درخت کے نیچے اصنام نصب کئے اور ان کی نذر کے لیے آگ روشن کی اور خدا کے تمام فرائض و حدود کو ترک کر دیا اور بعل





کی پرستش کی اور اپنے لیے طلائی گوسالے ڈھلوا کر بنوائے جن کی عبادت کرتے تھے، جس کی پاداش میں غضب ناک ہو کر رب نے ان کی تمام قوم کو ذلیل کر دیا اور اشوریین کے حوالہ کیا جنھوں نے اُن کو لوٹا اور برباد کیا۔ (ملوک دوم باب ۱۷ آیت ۷-۲۰)

عثلیا بنت عمری کی اولاد کے زمانۂ سلطنت میں بیت المقدس کو منہدم کر دیا گیا اور تمام معابد الٰہیہ صنم پرستی کے لیے وقف ہوگئے (اخبار ایام ثانی باب ۲۴ آیت ۷)

یہویاداع کے انتقال کے بعد تمام رؤسا ملک یواش کے پاس آئے اور اُس کو سجدہ کیا اور خدا کی عبادت کو ترک کر کے بُت پرستی اختیار کر لی۔ (باب ۲۴ آیت ۱۷-۱۸)

امصیا نے بادشاہ ہو کر بنی ساعیر کے بُت لا کر ان کے درمیان رکھے اور ان کو سجدہ کیا اور اُن کے لیے آگ روشن کی۔ (باب ۲۵ آیت ۱۴-۱۵)

احاز کی سلطنت ہونے پر پھر مورتیں تراشی گئیں جن کی عبادت ہوتی تھی اور اولادیں قربانی کے لیے جلائی گئیں اور بلندیوں کے اُوپر اور شاداب درختوں کے نیچے پرستش کے لیے بُت نصب کئے گئے جس کی پاداش میں ملک آرام کے ہاتھوں ان میں کے ایک لاکھ بیس ہزار آدمی قتل ہُوئے اور لاکھوں آدمی قید کئے گئے۔ (باب ۲۸ آیت ۲-۶)

ان لوگوں نے بیت المقدس کے دروازوں کو بند اور اُس کے چراغوں کو خاموش کر دیا اور خدائے برحق کی عبادت ترک کر دی۔ (باب ۲۹ آیت ۷)

بیت المقدس میں اتنی نجاست جمع ہوگئی تھی کہ حزقیال نے جب اس کی تطہیر کا ارادہ کیا تو آٹھ دن میں وُہ نجاستیں ہٹائی گئیں۔ (باب ۲۹ - آیت ۱۶-۱۹)

حزقیال کے بعد اس کے بیٹے منسی نے پھر کفر و شرک کی بنیادیں قائم کیں اور وہ تمام اصنام جو اُس کے باپ نے منہدم کئے تھے از سرِ نو قائم کر دیئے اور تمام یہودیوں کو گمراہ کرکے ایسے افعال کرائے جو گذشتہ نسلوں کے افعال سے بھی زیادہ قبیح تھے۔

(باب ۳۳۔ آیت ۱-۱۰)

بھلا ایک ایسی قوم جس نے مذہبی حیثیت سے اتنے پلٹے کھائے ہوں اور اتنی مرتبہ ارتداد کو اختیار کرکے کفر و شرک اور بُت پرستی کے راستہ پر لگی ہو اُس کے متعلق کہاں یہ

اطمینان ہو سکتا ہے کہ اُس نے کتاب الٰہی اور توریت حقیقی کو اس کی اصلی حالت پر رہنے دیا ہوگا یا اُس کی حفاظت میں کوئی اہتمام کیا ہوگا بلکہ اس کی کفر پروری اور باطل پرستی کا اقتضاء یہ ہے کہ وُہ اس میں اپنی خواہش کے مطابق طرح طرح کے تصرفات کرکے اُس کو اپنے مذاق کے موافق بنالے اور پھر جب کہ ہم کو موجودہ توریت کے اندر جا بجا شرک و تعدد آلہہ کے عقیدہ کی جھلک بھی نظر آرہی ہے جس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ توریت عبرانی میں اکثر مقامات پر خدا کا تذکرہ کرنے کے موقع پر لفظ "الوھیم" کا اطلاق ہُوا ہے اور عبرانی میں "م" علامت جمع ہے جس کے بنا پر معنی اس کے ہُوئے "خدایان" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مذہبی افتادِ طبیعت کا اثر توریت کے اوپر پڑے بغیر نہیں رہا اور اُن کے شرک و صنم پرستی کے مسلسل و متواتر تظاہرات نے توریت کے اندر بھی رنگ آمیزیاں کی ہیں۔

**دُوسری مصیبت** توریت کا اصلی نسخہ جو موسٰی نے خود لکھ کر اولادِ لاوی کے سپُرد کیا تھا اس کے متعلق ہدایت یہ تھی کہ وُہ تابوت عہدِ رب کے پہلو میں بیت المقدس کے اندر رکھا جائے۔ (سفر تثنیہ باب ۳۱ - آیت ۲۵ - ۲۶)

لیکن اس کے بعد تابوت عہدِ رب میں جو انقلابات ہُوئے اُن میں اس نسخہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا، مُہ وقت کہ جب فلسطینین نے بنی اسرائیل پر غلبہ حاصل کیا اور بنی اسرائیل نے اپنی انتہائی شکست کے خوف سے تابوت کو بیت المقدس سے نکال کر محلہ عبرانیین میں منتقل کیا اور فلسطینین کو اس کی اطلاع ہوگئی، جس کی بنا پر ایک مرتبہ انھوں نے حملہ کر دیا اور اسرائیلیین نے تابوت کو چھوڑ کر فرار کیا اور اہلِ فلسطین نے تابوت پر قبضہ کرلیا۔ اُس وقت اس نسخہ کا کوئی تذکرہ نہیں۔ (سموئیل اول باب ۴)

پھر جب داؤد نے اس تابوت کو بیت عوبید میں منتقل کیا اور تین مہینہ وہاں رکھنے کے بعد اپنے شہر صیہون میں لے گئے، وہاں بھی اس نسخہ کا کوئی ذکر نہیں۔

(سموئیل دوم باب ۶)

پھر جب سلیمان نے تابوت عہدِ رب کو خیمۂ اجتماع اور تمام مقدس ظروف کے ساتھ جو اس خیمہ میں تھے صیہون سے بیت المقدس کی محراب میں منتقل کیا تب بھی اس نسخہ کا نام و

 

نشان نہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نسخہ تابوت کے اندر تھا، اس لیے کہ اس موقع پر تابوت کے اندر بتصریح عہد قدیم صرف وُہ دو پتھر کی لوحیں تھیں جو مصر سے نکلتے وقت انھوں نے بطور معاہدہ بنی اسرائیل کے لیے مقام حوریب میں تابوت کے اندر رکھی تھیں،

(ملوک اول باب ۸ - آیت ۱ - ۱۰)

اگر یہ امر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ نسخہ تابوت کے پاس بیت المقدس کی محراب کے اندر موجود تھا تو کیا وُہ اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب رحبعام کے زمانہ میں شوشق بادشاہِ مصر نے اورشلیم پر چڑھائی کرکے خانۂ خدا کے تمام خزانے اور بیت المقدس کی (بلا استثناء) ہر چیز لوٹ کر اپنے قبضہ میں کرلی تھی۔ (ملوک اول باب ۱۴ آیت ۲۵ و ۲۶)

اگر وُہ اس وقت باقی بھی رہ گیا ہو تو کیا وُہ اس وقت رہ سکتا ہے، جب عثلیا کی اولاد نے بیت المقدس کو منہدم کر دیا تھا اور جتنی مقدس چیزیں اس میں تھیں وُہ اپنے بُت بعلیم کے لیے لے گئے تھے جس کے بعد یواش اور یہویا کو دوبارہ بیت المقدس کی از سرِ نو اُس کی سابقہ بنیادوں پر تعمیر کی ضرورت ہوئی تھی۔ (ایام دوم باب ۲۴ - آیت ۷ - ۱۳)

فرض کرو کہ اس وقت بھی وُہ نسخہ باقی رہا تو کیا اس وقت بھی وُہ باقی رہا جب یہواش مشرک نے اورشلم میں آکر اس کی چار دیواری کو چار سو ہاتھ کی مسافت تک منہدم کر دیا اور جتنا طلاؤ نقرہ اور جتنے ظروف بیت المقدس میں موجود تھے سب کو قبضہ میں کرلیا۔

(ملوک دوم باب ۱۴ آیت ۱۳ - ۱۴)

اچھا اس وقت وُہ باقی رہا تو کیا اس وقت وُہ تلف نہیں ہُوا جب احاز مشرک نے تمام بیت المقدس کی اشیاء کو ضبط کرکے بیت المقدس کے دروازوں میں قفل لگا دیئے اور اورشلم کے ہر گوشہ میں اپنے لیے مذابح یعنی قربانی کے مقامات مقرر کئے۔

(ایام ثانی باب ۲۸ آیت ۲۴)

اور کیا اس جماعت نے اس نسخہ کو چھوڑ دیا تھا کہ جس نے بیت المقدس کو نجاست سے اس طرح مملو کر دیا تھا کہ آٹھ دن اس کی صفائی میں صرف ہُوئے۔

(باب ۲۹ - آیت ۱۷)

درایت کے اصول پر ان واقعات کو دیکھنے سے یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ توریت کا اصلی نسخہ باقی نہ تھا اور وُہ انقلابات وحوادث کی نذر ہو گیا تھا۔

## تیسری مصیبت

توریت کے اصلی نسخہ کے سوا کسی دُوسرے نسخہ کا وجود بھی صدرِ اول میں پایا نہیں جاتا اور اگر پایا بھی جائے تو وُہ صرف دو ایک شخصوں کے پاس محدود تھا اور عام طور سے اس کے نسخوں کی اشاعت نہ ہُوئی تھی اور اس لحاظ سے اگر اصلی نسخہ مفقود ہو جاتا تو اس کا قائم مقام ملنا ممکن نہ تھا اور اس پر کوئی افتاد پڑتی خواہ اس کو مفقود کر کے دُوسرا اس کی جگہ پر ایجاد کر لیا جاتا یا خود اسی میں کمی زیادتی کر کے تراش خراش کی جاتی تو اس کی عام طور پر شناخت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

عہدِ مقدس میں تصریح موجود ہے کہ بنی اسرائیل پر بہت ایسے وقت گذرے ہیں کہ نہ اُن کے لیے کوئی سچا خدا تھا اور نہ کوئی تعلیم دینے والا کاہن جس کی تعلیمات پر وُہ چلتے اور نہ اُن کے لیے کوئی شریعت موجود تھی۔ (ایام دوم باب ۱۵۔ آیت ۳)

اور عبرانی نسخہ میں یہ ہے کہ نہ ان کے پاس اس زمانہ میں تورات تھی۔

وُہ وقت کہ جب یوشیا نے شاقان کاتب کو بیت القدس میں وہاں کے کاہن حلقیا کے پاس بیت القدس کے بعض داخلی انتظامات کے لیے بھیجا ہے اس موقع پر حلقیا نے کہا کہ مجھے بیت القدس میں سفر الشریعۃ (توریت) دستیاب ہُوا ہے اور وُہ سفر شاقان نے لا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اس کو پڑھ کر سُنایا، بادشاہ نے اس کو سُن کر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور کاہنوں کو بلا کر ہدایت کی کہ وُہ بارگاہِ خدا میں توبہ و انابت کریں ان مضامین کی بہت سے جو اس دستیاب ہونے والے سفر میں ہیں اس لیے کہ ہم نے اور ہمارے آباؤ اجداد نے اب تک ان تعلیمات پر عمل نہیں کیا۔ (ملوک دوم باب ۲۲ آیت ۸۔۱۳)

نیز بادشاہ نے تمام بزرگان یہودا و اورشلیم کو جمع کیا اور بادشاہ ان سب کو لے کر بیت القدس کی جانب گیا اور ان سب کو وُہ سفر پڑھ کر سُنایا اور خدا کے ساتھ عہد و پیمان لیا کہ اب وُہ اس کے احکام پر عمل کریں گے اور بادشاہ نے کاہنوں کو حکم دیا کہ وُہ بیت القدس سے تمام ان اسباب و آلات کو جو صنم پرستی کے لیے وہاں جمع کئے گئے تھے نکال کر اورشلیم





کے باہر آگ میں جلا دیں اور اس طرح جتنے فسق و فجور اور کفر و شرک کے ذرائع بیت القدس کے اندر اور ارد گرد تھے سب کو تباہ و برباد کر دیا۔ (باب ۲۳)

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے قبل سفر تورات موسائیوں کے ہاتھ میں موجود نہ تھا اور وُہ مفقود ہو چکا تھا جب ہی حلقیا کے ذریعہ سے بادشاہ نے جو تورات کے مضامین کو سُنا تو وُہ از خود رفتہ ہو گیا اور وُہ اس کو عجب چیز معلوم ہُوئے اور ان تعلیمات کو سُن کر جواب تک اُن کے گوش زد نہ ہُوئے ان تمام لوگوں پر خوف و ہراس کا غلبہ ہُوا۔

پھر جبکہ تورات کا نسخہ اس کے پاس موجود نہ تھا تو اس بات کی کون سی ضمانت ہو سکتی ہے کہ حلقیا نے جو کتاب تورات کہہ کر دی وُہ حقیقتاً تورات ہی تھی؟

کیا نہیں ممکن کہ بادشاہ کو صحیح راستہ پر لگانے کے لیے یہ حلقیا کی ایک چالاکی ہو جو برموقع نتیجہ خیز ثابت ہُوئی۔

پھر اس موقع پر کہ جب سبی بابل سے یہ لوگ نجات پا کر واپس ہُوئے اور خدا پرستی کی طرف توجہ کی تو تمام جماعت نے متفقہ حیثیت سے عزرا کاتب کے پاس آ کر مطالبہ کیا کہ وُہ سفر توریت کو لا کر اُن کے سامنے پڑھ کر سُنائے چنانچہ عزرا اُس سفر کو لے کر تمام جماعت کے سامنے جو مرد و زن سے مخلوط تھی لے کر آیا اور صبح سے دوپہر تک اس کو پڑھ کر سُناتا رہا، تمام مجمع گوش بر آواز تھا اور توریت کے مضامین کو سُن کر اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

دُوسرے دن تمام بڑے بڑے پادری اور کاہن اور لادین عزرا کے پاس جمع ہُوئے کہ وُہ اُن کو آیات توریت کے معنی سمجھائے چنانچہ اس میں لکھا ہُوا پایا کہ بنی اسرائیل ساتویں مہینہ میں عید کے دن چھتوں کے نیچے بسر کریں جس کو سُن کر سب چھتوں کے بنانے میں مشغول ہو گئے

(سفر نحمیا باب ۸)

توریت میں یہ بھی لکھا دیکھا کہ عمونیا اور موابیا کبھی موسائیوں کی جماعت میں داخل نہ ہونے پائیں اس لیے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کی، یہ سُن کر اُن لوگوں نے مذکورہ بالا اشخاص کو جماعت سے جُدا کر دیا (نحمیا باب ۱۳)

اس سے بھی غیر مشتبہ طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ توریت کا وجود صرف عزرا سے مخصوص

تھا یہاں تک کہ آبار، لیوعیین اور کاہن لوگ جو حقیقتاً توریت کے امانت دار تھے ان کے پاس بھی اس کا وجود نہ تھا ورنہ ان سب کو باتفاق عزرا کے پاس جمع ہو کر توریت کے سننے اور سمجھنے کی ضرورت نہ تھی اور نہ اس توریت سے ایسے احکام پر وُہ مطلع ہوتے جن سے اب تک وُہ بالکل بے خبر تھے اور اب توریت کے سننے کے بعد اُن کو توجہ پیدا ہوئی۔

جب توریت کا وجود اتنی محدود حیثیت رکھتا تھا کہ وُہ ہر وقت صرف ایک شخص کے پاس محفوظ تھا تو اب توریت کا اصل حالت پر باقی رہنا صرف اسی شخص کے رحم و کرم کا پابند ہے ورنہ اگر کہیں پر شخصی و نفسانی اغراض نے قلم کو جنبش دے دی تو اس کی نہ داد ہو سکتی ہے نہ فریاد اس لیے کہ سوائے اُس کے کوئی شخص توریت پر مطلع ہی نہیں ہے۔

مثال کے طور پر کیا یہ بھی نہیں ممکن کہ عمونیا و موابیا کو جماعت سے نکال دیئے جانے کا حکم جو توریت میں تازگی کے ساتھ پایا گیا اور موسائیوں کو خواہ مخواہ اس پر عمل کرنا پڑا وُہ کسی ذاتی کاوش کا نتیجہ تھا کہ جو عزرا کو ان اشخاص سے پیدا ہو گئی تھی۔

یقیناً جبکہ تورات ایک یا دو شخصوں کا مخصوص سرمایہ قرار پا گئی تو اب نہ اس میں تواتر کا دعوٰی ہو سکتا ہے اس لیے کہ تواتر کے لیے اتنی جماعت کی ضرورت ہے جن کا خلافِ واقعہ بات کے بیان کرنے پر متفق ہو جانا ناممکن ہو اور نہ اس کے کسی قسم کی تحریف و تبدیل کے خلاف کوئی ضمانت ہو سکتی ہے۔

**چوتھی مصیبت**

خود کتاب مقدس میں متعدد جگہ اس کے تصریحات پائے جاتے ہیں کہ توریت میں تحریف ہوئی ہے اور وُہ اپنی حالت پر باقی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو سفر ارمیا باب ٢٣ آیت ٣٦۔

"وحی الٰہی کا تو نام ہی نہ لو اس لیے کہ وحی ہر شخص کی وہی ہے جو اُس کا کلام ہو اور تم نے خدا کے کلام میں تحریف کر دی ہے۔"

نیز باب ٨ آیت ٨

"کس طرح تم کہتے ہو کہ ہم حکماء ہیں اور شریعتِ خدا (توریت) ہمارے پاس ہے۔ یقیناً یہ غلط ہے۔ اس شریعت کو تو لکھنے والوں کے دروغ گو قلم نے بدل دیا ہے۔"





سفر اشعیا باب ٢٩ آیت ١٦ میں ہے۔

"اُف ری تمہاری تحریف"

افسوس ہے کہ ان تصریحات میں تحریف کی نوعیت کو بھی بتلا نہیں دیا گیا ہے جس کی بنا پر ہر قسم کی تحریف کا شبہ ہو سکتا ہے اور پھر سفر ارمیا والی پہلی آیت سے تو صاف ظاہر ہے کہ تحریف اس حد پر ہوئی جس نے اس کو درجۂ اعتبار سے ساقط کر دیا جب ہی کہا جاتا ہے کہ "وحی آسمانی کا نام ہی نہ لو۔

اور دُوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریف احکام الٰہیہ کو بھی صدمہ پہنچائے بغیر نہیں رہی جب ہی یہ کہنے سے منع کیا گیا ہے کہ شریعت خدا ہمارے پاس موجود ہے۔

ان تمام مصائب کے بعد جنھوں نے کتاب مقدس کی زندگی کو مشکوک بنا دیا، یہ کسی صورت پر باور نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ توریت یا اس کا کوئی ایک جزو بھی بالکل وہی ہے جو موسٰی پر نازل ہوئی تھی بلکہ پوری کتاب کے متعلق یہ شبہ پیدا ہونے کا حق ہے کہ وُہ کسی جدت طرازی اور طبع آزمائی کا نتیجہ ہے جس طرح اُس کے ہر ہر جزو کے متعلق یہ خیال کیے جانے کا موقع ہے کہ وُہ کسی کی تراش و خراش کا نتیجہ ہو اور اس کے بعد کسی ایک لفظ کے متعلق بھی بوثوق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وُہ یقیناً وحی آسمانی کے مطابق اور خدا کا کلام ہے۔

اور پھر لطف یہ ہے کہ خود اس میں ایسے شواہد موجود ہیں جو بتلا رہے ہیں کہ وُہ پورے کا پورا خدا کا کلام نہیں ہے جو موسٰی پر نازل ہوا تھا یہاں تک کہ سفر تثنیہ کے باب ٣٤ میں موسٰی کی وفات کا قصہ اور بنی اسرائیل کی اُن پر گریہ و زاری تک کا تذکرہ موجود ہے چنانچہ اُس میں لکھا ہے۔

"موسٰی زمین موآب میں انتقال کر گئے اور وہیں دفن ہوئے اور آج تک کسی کو اُن کی قبر کا پتہ نہیں چلا اور موسٰی کی عمر اس وقت ایک سو بیس برس کی تھی۔ باوجود اس کے ان کی آنکھوں کی بصارت اور اُن کے چہرہ کی شادابی میں فرق نہ آیا تھا۔ بنی اسرائیل تیس دن تک موسٰی پر گریہ و زاری کرتے رہے اور یوشع بن نون رُوحِ حکمت سے پُر تھے اس لیے کہ موسٰی نے اپنا ہاتھ اُن پر رکھا تھا۔ بنی اسرائیل نے ان کی اطاعت کی اور ان احکام پر عمل کیا جو

رب نے موسٰی کو دیئے تھے۔ موسٰی کے بعد پھر کوئی ویسا بنی اسرائیل کو نصیب نہیں ہوا جس سے خدا منہ در منہ شناسائی پیدا کرے"۔
یہ لفظیں ہرگز اس تورات کی نہیں ہو سکتیں جو خدا نے موسٰی پر نازل کی تھی، بلکہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ وُہ موسٰی کے انتقال سے بہت دن کے بعد تصنیف کی گئی ہیں۔

## انجیلؑ اور اُس کی موجودہ حیثیت

توریت کے بعد دُوسرا نمبر انجیل کا ہے اس لیے کہ وُہ عیسائیوں کی مقدس کتاب ہے جو مذاہب عالم کی مردم شماری میں اس وقت اوّل درجہ رکھتے ہیں، بے شک انجیل آسمانی کتاب ہے جو رب کی جانب سے عیسٰیؑ پر نازل ہُوئی تھی لیکن کیا اس کا وجود باقی ہے اور کیا موجودہ اناجیل جن کے ہزارہا زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں اور ہر سال لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں ان میں کوئی حصّہ اور کوئی جُزو بھی یقینی طور پر وحی آسمانی ہے؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔
انجیل کے متعلق گوناگوں وجوہ پر نظر کرنے سے اس امر کا کوئی اطمینان باقی نہیں رہتا کہ موجودہ اناجیل میں وحیٔ الٰہی کا بھی کوئی حصّہ ہے۔

**پہلی وجہ** اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسٰی پر جو انجیل نازل ہُوئی تھی وُہ ایک ہی تھی، اُس میں دو تین چار یا اس سے زیادہ کی تعداد کا پتہ نہ تھا لیکن انجیل کے نام سے جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان کی تعداد دس بیس پچاس سے گذر کر سو بلکہ اس سے زیادہ تک پہنچ گئی جس کی تصریح اورشین۔ اذیب۔ شیردم وغیرہ اکابر مسیحیین کے کلمات میں موجود ہے۔
عیسٰیؑ کے آسمان پر اُٹھائے جانے کے چار سو برس بعد اختلافات سے عاجز آکر ان پانچ انجیلوں پر اتفاق کیا گیا جن میں سے چار یہی ہیں کہ جو مشہور ہیں اور ایک انجیل صبوہ ہے جس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور وُہ پطرس کی طرف منسوب ہے جس میں مریم کی زبانی مسیح کے بچپنے کے حالات کا تذکرہ ہے۔ اس صورتِ حال کے دیکھنے پر کیا یہ امر صاف ظاہر نہیں ہے کہ انجیل کا اصلی نسخہ عیسائیوں کے پاس موجود نہ تھا اسی لیے سہ




ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی

جس شخص کا دل چاہا اس نے اُٹھ کر اپنے دل سے ایک انجیل تصنیف کر کے عیسٰی کی طرف منسوب کر دی اور اگر فرض بھی کیا جائے کہ ان نسخوں میں سے کوئی ایک حقیقی انجیل کا نسخہ تھا تو کیا ممکن نہیں کہ ان پچانوے چھیانوے میں سے ہو کہ جنھیں درجۂ اعتبار سے ساقط کر کے چھوڑ دیا گیا اور ان چار یا پانچ انجیلوں میں سے کوئی بھی حقیقی انجیل سے تعلق نہ رکھتا ہو۔
اور اگر وُہ نسخہ ان چار کے اندر موجود بھی ہو تو جب کہ ان چار میں لفظی و معنوی ہر قسم کے اختلاف اور تناقضات پائے جاتے ہیں تو اس کی تعیین کیونکر ہو سکتی ہے اور درصورت عدم تعیین ان چاروں کو برابر سے کلام الٰہی اور وحی آسمانی سمجھنا جو عیسائیوں کا نقطۂ نظر ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟

**دُوسری وجہ** اس وقت کہ جب مسیح شیطان کی آزمائش کے بعد واپس ہُوئے ہیں اور پہلے پہل بیت المقدس کی طرف گئے ہیں کہ اپنی رسالت کی تبلیغ یہود میں کریں تو پہلی بات جو عیسٰی کی زبان سے نکلی تھی وُہ یہ کہ "زمانہ کا دور پورا ہو چکا ہے اور خدائی سلطنت کا عہد قریب آ گیا ہے۔ اب تم لوگ توبہ کرو اور انجیل پر ایمان لاؤ۔
(انجیل مرقس باب ۱ آیت ۱۵)
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس وقت موجود تھی جس کا نام انجیل تھا اور کون نہیں جانتا کہ اُس وقت جو ابتدائی دور رسالت مسیح کا تھا ان واقعات میں سے کہ جو موجودہ اناجیل کے اندر مذکور ہیں کسی کا پتہ بھی نہ تھا۔ اسی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ موجودہ اناجیل وُہ نہیں ہیں کہ جن پر عمل کی دعوت عیسٰی نے اپنے ابتدائے نبوت ہی سے دی تھی۔

**تیسری وجہ** مسیحی دیانت کی نشو و نما ناصرہ میں کچھ ماہی گیروں کے گروہ میں ہُوئی تھی جن کو علم اور ادب سے کوئی بہرہ نہ تھا اور پھر یہ لوگ یہودیوں کی کثیر التعداد جماعت کے اندر بے کسی اور بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس لیے مسیح کے واقعات اور تعلیمات خود اُن کے زمانہ میں قلمبند نہ ہُوئے مسیح کو بھی اُن ہمت شکن مصائب کی بدولت جو انھیں آخر وقت تک یہودیوں کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑے جن کی وجہ سے اُن کو بہت

کم عمری میں زمین پر سے اٹھا لیے جانے کی ضرورت محسوس ہُوئی یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ اپنے تعلیمات کی جمع آوری کا انتظام کریں۔ اُن کے ساتھ والوں کو جو آخر تک تعداد میں بہت کم رہے تھے اتنا بھی موقع نہ ملا تھا کہ وُہ اس انجیل کو جو عیسٰیؑ پر نازل ہُوئی تھی اپنے پاس نقل کر کے محفوظ رکھ سکیں اور اس انجیل میں سے سوائے بعض فقرات کے جو معدودے چند افراد کو کہیں کہیں پر سے یاد تھے کوئی جزو بھی اُن کے پاس قید تحریر میں نہ تھا۔ مسیح کے اٹھائے جانے کے بعد ہی اُن میں جنگ و جدال کا بازار گرم ہو گیا جس میں ہزاروں آدمیوں کی جانیں تلف ہُوئیں اور ان پریشانیوں کے باعث مذہبی بنیادوں کے مضبوط کرنے کی کوئی فکر نہ ہوئی وُہ چند فقرات انجیل کے جو سینوں میں محفوظ تھے اُن میں بھی امتدادِ زمانہ نے تغیّر و تبدّل پیدا کر دیا پھر جس کو اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا ہُوا اُس نے اپنی طرف سے اضافہ کر کے ایک انجیل تیار کر دی جس کی صحت کا دار و مدار بھی صرف اُس شخص کے دعوے پر ہے جو اس انجیل کا مصنّف ہے۔

### چوتھی وجہ

موجودہ اناجیل میں سب سے زیادہ معتبر و مستند انجیل متی ہے اس لیے کہ متی باتفاق مسیحین حواریین حضرت عیسٰی میں سے تھے اور اُن کی انجیل مسیح کے اٹھائے جانے کے آٹھ برس کے بعد تمام دیگر اناجیل سے پہلے عالم وجود میں آئی ہے لیکن اس انجیل کی تاریخ اتنی تاریک ہے کہ اس میں تحقیق کا روشن ترین چراغ بھی جھلملا کر گُل ہونے لگتا ہے۔

یہ امر شواہد و تصریحات کی بنا پر ناقابلِ انکار ہے کہ انجیل متی کی اصل عبرانی زبان میں تھی جو اُنھوں نے تازہ ایمان لانے والے یہودیان اورشلیم کی خاطر سے لکھی تھی لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انجیل کا وُہ اصلی نسخہ اب دُنیائے مسیحیت میں موجود نہیں ہے اور وُہ آج یا آج سے سو برس پہلے نہیں بلکہ دُوسری یا تیسری صدی عیسوی ہی میں مفقود ہو چکا تھا اس کے مفقود ہونے کے بعد یہ ترجمہ نکلا جو یونانی زبان میں ہے اور جو اب دُوسری زبانوں کے تراجم کی اصل ہے لیکن اس مترجم کا کوئی پتہ نہیں معلوم ہے کہ یہ کون شخص تھا اور اس کے خصوصیات کیا تھے؟ وُہ مسیحی تھا یا یہودی یا کسی دُوسرے مذہب کا شخص؟ اور آیا اُس کو




اس ترجمہ کے ذریعے سے مسیحی تعلیمات کا پھیلانا مقصود تھا یا اُن کو مٹانا؟ اور کیا وُہ عبرانی و یونانی دونوں زبانوں میں اتنی قابلیت بھی رکھتا تھا کہ اُس کے ترجمہ پر کامل اعتماد کیا جائے؟ اور مذکورہ بالا صورت حال میں کیا یہ شبہ پیدا نہیں ہوتا کہ ترجمہ کی نشر و اشاعت کے موقع پر اصل انجیل کا مفقود کر دینا اسی غرض سے تھا کہ جو دل بخواہ تصرفات کئے گئے ہیں اُن کا راز فاش نہ ہو سکے اور جو پردہ اُن پر پڑا ہُوا ہے وُہ زیادہ گہرا ہو جائے اور کسی شخص کو موقع نہ ہو کہ وُہ اصلی نسخہ کے ساتھ مطابقت کر کے اس کی غلطیوں کو طشت از بام کر سکے۔

پھر جب یہ صورت ہے تو نصارٰی کی سادہ لوحی نہیں تو کیا ہے کہ وُہ اس انجیل پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور یقین کئے ہوئے ہیں کہ وُہ متی کی لکھی ہُوئی ہے؟ حالانکہ اس کے مترجم کا پتہ نہیں اور نہ معلوم کتنی گمراہ کن باتیں اُس میں ایسی درج کر دی گئی ہیں جن سے نہ متی کی رُوح خوش ہو گی اور نہ حضرت مسیحؑ ان کو پسند فرماتے ہیں۔ کیا نہیں ممکن کہ عبرانی نسخہ کسی یہودی کے ہاتھ میں پڑ گیا ہو اور اس نے صرف مسیحی تعلیمات کو برباد کرنے کی غرض سے اُس میں جو چاہا اپنی جانب سے تصنیف کر کے لگا دیا ہو۔

### پانچویں وجہ

انجیل متی کے علاوہ جو انجیلیں ہیں اُن کے مصنفین نے حضرت عیسٰیؑ کے تعلیمات کو بذاتِ خود حاصل کرنا تو درکنار اُن کی صُورت بھی نہیں دیکھی۔

مرقس لاوی کی اولاد میں سے ایک یہودی شخص تھا جس نے پطرس کی شاگردی اختیار کی اور اہلِ رومیہ کی فرمائش سے اس انجیل کو تصنیف کیا۔ (دیکھو کتاب مروج الاخبار فی تراجم الابرار مصنفہ پطرس قرماج مسیحی مطبوعہ بیروت ۱۸۸۰ء)

عیسائیوں کا یہ دعوٰی کہ مرقس نے اس انجیل کو پطرس کی صوابدید کے مطابق تیار کیا تھا اور اس طرح اس کا سلسلہ عیسٰیؑ کے حواریین تک پہنچتا ہے سند کا محتاج ہے۔ کسی کا دُوسرے شخص کی شاگردی میں ہونا اس امر کا ذمّہ دار نہیں ہو سکتا کہ شاگرد جو کچھ لکھے وُہ حرف بحرف استاد کی طرف منسوب ہو۔

اب رہ گیا تیسری انجیل کا مصنف لوقا اس کے متعلق دُنیائے نصرانیت میں اتنا اختلاف ہے کہ ہم اس کو جہالت اور گمنامی میں انجیل متی کے مترجم کا ثانی سمجھ سکتے ہیں۔

اتنا اتفاقی مسئلہ ہے کہ یہ شخص پولوس کا شاگرد تھا اور اس نے کبھی مسیح کی صورت نہ دیکھی تھی۔ یہ انطاکیہ کا رہنے والا طبیب تھا اور بعض نے کہا ہے کہ مصور تھا۔

بعض علمائے نصارٰی نے اس کی تصریح کی ہے کہ لوقا نے اس انجیل کو مرقس والی انجیل کے بعد لکھا ہے اور اُس وقت پطرس و پولوس دونوں کا انتقال ہو چکا تھا اور اس انجیل کے الہامی ہونے کا عقیدہ تو یہیں سے تشریف لے جاتا ہے۔

رہ گئی انجیل یوحنا اس کی حالت زیادہ گریہ خیز ہے۔ پہلے تو یہ امر پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچ سکا کہ اس انجیل کے مصنف وُہ یوحنا ہیں جو عیسٰی کے شاگردوں میں سے تھے بلکہ بعض علمائے مسیحیین کا خیال ہے کہ یوحنا کی انجیل مدرسۂ اسکندریہ کے ایک طالب علم کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔

اور بعض اربابِ تحقیق نے صاف طور پر لکھا ہے کہ انجیل اور جتنے رسالہ یوحنا کی طرف منسوب ہیں وُہ اُن کے نہیں ہیں بلکہ کسی نے دُوسری صدی عیسوی کے اوائل میں انہیں تصنیف کر کے یوحنا کے سر تھوپ دیا ہے تاکہ لوگوں کی نظر میں اُن کی قدر ہو۔

اس پر طرّہ یہ کہ اس کتاب کا سببِ تصنیف جو بتلایا جاتا ہے وُہ خود اس کے الہامی ہونے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا تذکرہ ترجمہ انجیل مصنفہ جرجس زوین لبنانی مطبوعہ بیروت ۱۸۷۳ء میں موجود ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رومیہ میں بادشاہ کی جانب سے یوحنا کے متعلق حکم ہُوا کہ وُہ زندہ پکتے ہُوئے تیل میں ڈال دیئے جائیں لیکن ان کو موت نہ آئی اس وقت وُہ جزیرہ باطموس کی طرف جلا وطن کر دیئے گئے۔ بادشاہ کے مرنے کی خبر سُن کر یہ پھر مقام افسس کی جانب گئے۔

شیرنیطوس اور ابیون اور ان کے ساتھ والے جو کہ مسیحی مذہب کو اس عقیدہ کے ساتھ رکھتے تھے کہ عیسٰی ایک انسان تھے بلکہ خدائی کا درجہ رکھتے تھے۔ اس لیے سنہ ۹۶ء میں تمام ایشیا کے پادری جمع ہُوئے اور اُنھوں نے یوحنا سے خواہش کی کہ وُہ حضرت عیسٰیؑ کے متعلق ایک انجیل تصنیف کریں جس میں وُہ چیزیں درج ہوں جو اب تک دُوسری انجیلوں میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں اور خاص طور پر اس میں مسیح کی الوہیت کو ثابت کریں۔ اُن





لوگوں کے اصرار پر یوحنا کو مجبور ہونا پڑا اور اُن کی خواہش کو رَدّ کرنا ممکن نہ ہُوا۔

اس بیان سے حقیقت صاف نظر آنے لگتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس انجیل کے وجُود میں آنے کا باعث کیا تھا؟ بات یہ ہے کہ عیسٰیؑ کے زمین پر سے اُٹھنے کو جتنا زمانہ زیادہ گزرتا تھا نئے نئے اور بدعت آمیز عقیدوں کی پیداوار بڑھتی جاتی تھی اور حقائق کی جگہ توہمات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا تھا، پہلی دوسری اور تیسری انجیل کی تصنیف تک عیسٰی کی تعلیمات کا کچھ اثر باقی تھا جس کی بنا پر اُن میں الوہیتِ مسیح کا صریحی تذکرہ نہیں ہے لیکن اس کے بعد اس عقیدہ نے کافی ترقی کی اور اُس عقیدہ کے مبلغین نے محسوس کیا کہ یہ بہت بڑی کمزوری ہمارے اس عقیدہ کی ہے کہ ہماری انجیل اس سے خالی ہے اور ایسے اہم مسئلہ کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں۔

بس پھر کیا تھا۔ ایک نئی انجیل کے تصنیف کی رائے ٹھن گئی اور آخر وُہ یوحنا کے قلم سے پوری ہو گئی۔

کیا اس صورتِ حال کے بعد اس انجیل کو الہامی کہا جا سکتا ہے؟

مسیحیین نے یہ بات نکالی ہے کہ یوحنا نے جب انجیل لکھنے کا ارادہ کیا ہے تو مخصوص طور پر ایک قلبی نماز خدا کی بعیت کے ساتھ ادا کی تھی تاکہ رُوح القدس اُن پر وحی لاتے رہیں لیکن افسوس ہے کہ رجوعِ قلب سے نماز پڑھنا اس امر کی سند نہیں ہو سکتا کہ اس انجیل میں جو کچھ لکھا گیا وُہ رُوح القدس کی لائی ہُوئی وحی ہے ورنہ علمائے نصارٰی روزانہ ایک قلبی و روحانی نماز پڑھ کے وحی اُتروا لیا کرتے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ اناجیل میں کسی صورت سے بھی الہامی ہونے کا عقیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔

**چھٹی وجہ**

خود انجیلوں کے دیکھنے اور سرسری نظر سے بھی اُن کا مشاہدہ کرنے سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ وُہ کتاب نہیں ہے جو خدا نے عیسٰیؑ پر نازل فرمائی تھی بلکہ وُہ درحقیقت مسیح کی تاریخ زندگی اور سوانح حیات کا مجموعہ ہے جس کو چار شخصیتوں نے متغائر لیکن ملتے جلتے پیرایوں میں جمع کیا ہے اور ایک کو دُوسرے کے تحریرات سے

اختلاف وتناقض کی پرواہ بھی نہیں ہے اُن کی ابتداء اور انتہا خود اُن کی تاریخی حیثیت کی شاہد ہے۔

انجیل متی کی ابتداء "باب اول کتاب نسب نامۂ عیسٰی مسیح بن داؤد بن ابراہیمؑ" سے اور انتہا وفات عیسٰی اور ان کے دفن وکفن اور زندہ ہو کر آسمان کی طرف جانے پر ہُوئی ہے انجیل مرقس کی ابتداء یحیٰی تعمید دہندہ کے قصّہ اور عیسٰی کی بعض کرامات سے ہُوئی ہے اور انتہا عیسٰی کی وفات ودفن وغیرہ کے حالات پر ہے۔

انجیل لوقا کے شروع میں تو خود اس کے مصنّف کی جانب سے بہت صاف صاف لکھا گیا ہے کہ یہ اُن واقعات وحکایات کا مجموعہ ہے جو مجھ کو موثّق ذرائع سے اور پیش رو معتبر راویوں سے معلوم ہوئے ہیں اور مجھ کو صلاح معلوم ہُوئی کہ اُن کو حرف بحرف سلسلہ وار تحریر کروں۔ انتہا اس کی بھی عیسٰی کی وفات اور اس کے بعد والے واقعات پر ہُوئی ہے انجیل یوحنا کی ابتداء بھی یحیٰی کی حکایت سے اور انتہا عیسٰیؑ کے انجام کار پر ہو گئی ہے اور آخر میں صریحی طور پر لکھا گیا ہے کہ یہ وُہ واقعات ہیں جن کو عیسٰیؑ کے ایک شاگرد نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اُن کو اپنے قلم سے لکھا ہے اور وُہ مصنّف انجیل کے نزدیک صحیح و درست ہیں۔ یہ عیسائیوں کی سادہ لوحی ہے کہ وُہ باوجود ایسے صریح علامات وامارات کے موجودہ انجیل کو عیسٰیؑ پر اتری ہُوئی الہامی کتاب سمجھتے اور اس کو وحیٔ الٰہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

## وید مقدّس کی اصلیت

ہندوستان کے اصلی باشندے اور موجودہ زمانہ میں ہندوستان کے اندر اکثریت رکھنے والی قوم جو ہندو کے نام سے مشہور ہے اس کی مقدّس کتاب کا نام وید ہے جو چار حصّوں میں پائی جاتی ہے۔ رگوید، یجروید، سام وید، اتھرپ وید، سناتن دھرمی ہندوؤں کا خیال ہے کہ ان چار کتابوں میں صرف وُہ منتر ہیں جو عبادت کے موقع پر تلاوت کئے جاتے ہیں لیکن کسی قسم کے قانون اور قاعدے جو انسان کو صحیح راستہ پر لگائیں اور ایسے احکام جن کی پابندی





فرض ہو وُہ ان کے اندر موجود نہیں ہیں اور اگر ہیں تو وُہ ایسے مبہم طور پر ہیں کہ جن سے اعلیٰ درجہ کے پاک نفس اور روشن ضمیر اشخاص ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس بناء پر وُہ لوگ براہمن گرنتھوں کو جن کے نام شت پتھ گوپتھ۔ ایتریتھ اور تانڈیتھ ہیں وید کی جگہ پر سمجھتے ہیں اور انہی کو ہر طرح کے ہدایات کا مجموعہ خیال کرتے ہیں اور اُن کے بعد منوسمرتی وغیرہ کا درجہ ہے لیکن سوامی دیانند سرسوتی جو آریہ سماج کے موسس اور بانی ہیں اُنھوں نے مذکورہ بالا ویدوں کو بہت زیادہ اہمیت دے دی ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قسم کے احکام اور معارف انھی ویدوں سے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور سوا ان چار ویدوں کے باقی کسی کتاب سے سروکار رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس غرض کے لیے انھوں نے "ستیارتھ پرکاش" لکھی ہے جس میں ویدوں کی تفسیر اپنے طبعزاد خیالات کی بناء پر اس عنوان سے کی ہے کہ معنی کو لفظ سے اور شرح کو متن سے کچھ لگاؤ ہی نہ معلوم ہو اور اس طرح انھوں نے اِس دعوے کو حدِ ثبوت تک پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ دُنیا کے ہر مشکل سے مشکل مسئلہ کو حل کرنے والے وید مقدّس ہی ہیں۔ اس طرح پر آریہ مذہب کا تمام سرمایہ بلکہ شہ رگِ حیات وید ہی رہ جاتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ جب ہم ان ویدوں کے سند واعتبار پر نظر ڈال کر آخری کڑی کو اوّل سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں تو تاریکی کا ایک موج زن دریا سامنے آجاتا ہے جس میں اختلافات کے پُرپیچ بھنور نقطۂ تحقیق کو دُور سے دُور تر بنا دیتے ہیں۔

ان ویدوں کی اصلیت اتنے پردوں میں مخفی ہے جن کا اُٹھانا اُن کے عقیدت مندوں کے امکان سے باہر ہے۔

**پہلا پردہ**

"وید کس پر نازل ہُوئے" یہی ایک ایسا سوال ہے جو اب تک مسلّم حیثیت سے طے نہیں ہُوا ہے۔ سناتن دھرمی صاحبان کا یہ قول ہے کہ دُنیا کے شروع میں پرمیشور نے برھما نامی دیوتا کو پیدا کیا اور انہی کو یہ چاروں وید پڑھا دیئے تھے۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ وید چار نہیں بلکہ ایک ہی تھا جسے برھما نے اپنے شاگردوں سے رشی لوگوں کو پڑھایا تھا اور بہت زمانہ کے بعد وُہ ایک سے چار حصّوں میں تقسیم کئے

گئے۔ یورپ کی سنسکرت دان جماعت کا قول یہ ہے کہ چاروں وید چار مختلف زمانوں میں تصنیف ہوئے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے رگ وید ہے جو کہ نہایت قدیم ہے۔ کچھ سناتنی اصحاب کا یہ بھی قول ہے کہ اوّل ایک ہی وید تھا لیکن ویاس جی نے اس خیال سے کہ اس زمانہ کے لوگ اس قدر محنت نہ برداشت کرسکیں گے کہ اس کو پڑھیں اس کو چار حصّوں میں تقسیم کردیا اور ہر ایک وید کو ازبر کرنے والوں کے خاص خاص خاندان برہمنوں میں مخصوص ہوگئے چنانچہ ویدی (یعنی ایک وید والا) دوبے (دو وید والا) تواری (تین وید والا) چوبے (چار ویدوں والا) اب تک برہمنوں کی خاص خاص ذاتیں بنی ہوئی ہیں۔ ان سب کے خلاف سوامی دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج جو جدّت طرازی کے گرویدہ تھے انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ چار وید چار شخصوں پر نازل ہوئے ہیں جن کو رشی یا مہرشی کہا جاتا ہے اور وہ چاروں آغازِ آفرینش میں بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے اور ان چاروں ملہموں سے ہی برہما جی نے چاروں ویدوں کو پڑھا تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھو کتاب تحفہ آریہ سماج۔ ج۲)

پھر بھلا ایک ایسی کتاب کا کیا وزن ہوسکتا ہے جس کے متعلق خود اس کے ماننے والے اب تک طے نہ کرسکے ہوں کہ وہ نازل کس پر ہوئی تھی؟

**دُوسرا پردہ** وید خدائی کلام ہے یا مخلوق کا ساختہ؟ یہ بھی اب تک ہندوؤں اور آریوں میں مسلّمہ حیثیت سے طے نہیں پایا ہے۔

کہیں تو یہ بلند بانگ دعویٰ ہے کہ "وہ انسانی ایجاد سے مبّرا ایشور اور اس کے احکامات کے مبین کلمات کا نام وید ہے" (دیکھو سرسوتی جی کی کتاب "رگوید آدی بھاشیہ بھومکا" مطبوعہ اجمیر طبع سوم صفحہ۲)

اور اسی بنا پر آگے بڑھ کر صفحہ۲۹ پر ہے کہ "وید اور اس کے ماسوا جملہ الفاظ قدیم ہیں" حالانکہ قدامت کا دعویٰ اُن تصریحات کے مطابق بالکل بودا ثابت ہوتا ہے جن میں سلسلۂ تخلیق و تکوین میں ویدوں کا تیسرا یا چوتھا نمبر قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ اتیرتیہ برہمن میں لکھا ہے۔

"پرجاپتی نے خواہش کی کہ میں ظاہر ہوں بہت ہوں اس نے نہایت غور و خوض سے





دیکھا اور اپنے پورے تدبّر کے بعد پرتھوی لوک (کرۂ ارض) انترکش لوک (عالمِ وسطی) اور دیولوک (عالمِ علوی) تین طبقوں کو پیدا کیا۔ پھر اُن تینوں طبقوں کو بنظرِ غور دیکھ کر اُن سے تین جیوتی یعنی شعاعیں پیدا کیں۔ طبقۂ ارضی سے اگنی وسطی سے وایو اور علوی سے سوریہ ان تینوں جیوتیوں سے نہایت تفحص کے بعد اُس نے تین وید پیدا کیے اگنی سے رگوید۔ وایو سے یجروید اور سوریہ سے سام وید"۔

اور اسی مضمون کی عبارتیں شت پتھ براہمن اور گوپتھ براہمن اور چھاندوگیہ اُپ نشد میں بھی موجود ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو پنڈت سیتہ (دیوجی کی کتاب "ویدوں کے ظاہر کنندہ" مطبوعہ بنارس)

اور پرشنو اُپ نشد کے چھٹے پرشن کے چوتھے منتر میں تو ویدوں کا ساتواں آٹھواں نمبر قرار دے دیا گیا ہے۔ "اس ہستی مطلق نے (پہلے) پران کو پیدا کیا اس کے بعد امید کو اُس کے بعد خلا ہوا۔ آتش، پانی اور زمین کو اُس کے بعد حواس عشرہ اور دل کو اُن کے بعد اناج کو اناج سے مادۂ انسانی کو اُس سے تپ (ریاضت) کو اس سے منتروں کو"۔

مذکورہ بالا عبارات میں باوجود اُن اختلافات کے جو موجود ہیں اتنا ضرور مشترک حیثیت سے پایا جاتا ہے کہ وید خدا کا کلام یا براہِ راست اس کے مخلوق ہیں۔ لیکن اس کے بالکل برخلاف بعض مقدس کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ویدوں کے بنانے والے انسانی نوع کے افراد ہیں اور اُن کا براہِ راست کوئی تعلق خدا سے نہیں ہے چنانچہ "مہری منش پوران ادھیائے، شلوک ۵۰ سے ۵۳ تک لکھا ہے کہ "منتر اور دیاکرن ان عالمِ علوی میں رہنے والے سات رشیوں کے تپ (ریاضت) کا نتیجہ ہیں کہ جنہیں دُنیادار لوگ ماضی و حال اور مستقبل تینوں زمانوں میں صاحبِ منتر و یاکرن اور باحشمت سمجھ کر سرنگوں ہوتے ہیں کیونکہ یہ ساتوں رشی سات اوصاف سے متصف عمر دراز منتروں کے مصنف و مالک کہلاتے ہیں"۔

اور پنڈت ستیہ ورت سام شرمی اپنی کتاب (ترئی پریچے "صفحہ۲۳") میں تحریر کرتے ہیں۔

"وید ہمارے گذشتہ رشیوں کے ذریعہ بنائے گئے ہیں۔ یہ بالکل صحیح عقیدہ ہے"۔

کسی ایسے شخص کا قول نقل کرنے کے بعد جس کا خیال ہے کہ "سمرتیاں مستند نہیں ہیں

اس لیے کہ دھرم کا سرچشمہ وید ہے، وید کے علاوہ سب کچھ غیر مستند یا قابلِ ترک ہے، کیونکہ وُہ خدائی کلام نہیں"۔

اس کے جواب میں رقم طراز ہیں کہ

"سمرتیاں یقینی طور پر مستند ہیں کیونکہ ویدوں اور سمرتیوں دونوں کے بنانے والے برابر ہیں"۔

اس عبارت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ وید کے بنانے والے مثل سمرتیوں کے مصنفین کے انسان ہیں اور وُہ خدائی کلام نہیں۔

(مہا بھارت کا دھارتک اتہاس) صلا۳ میں لکھا ہے کہ "وید کسی خاص کتاب کا نام نہیں ہے بلکہ مختلف رشیوں کے لاثانی تجربات کے خاص اصولوں کے مجموعہ کا نام وید ہے"۔

ص۳۵ میں ہے "پرانے زمانہ کے ہندوستانیوں نے خود ہی اپنی تاریخ ان ویدوں میں جمع کر رکھی ہے"۔

ص۳۶ "سنسکرت زبان میں جامع وید کے مانند اور کوئی کتاب پرانی نہیں مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پانچوں جامع ایک ہی وقت میں تھے اور ان میں ایک ہی قسم کا دھرم ظاہر کیا گیا ہو" اودیا اچاریہ کی کتاب کسما نجلی ص۳۳

"وید انسانی کلام ہے کلام ہونے کی حیثیت سے مہا بھارت کی طرح وید انسانی حکایات ہیں"۔

پھر ایک ایسی کتاب جس کے متعلق خود اس کے معتقدین اس پر متفق نہ ہوں کہ وُہ خدا کا کلام ہے وُہ دُوسرے افراد سے کس طرح اپنے الہامی ہونے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرا سکتی ہے؟!

اور پھر جب کہ خود وید مقدس بھی اپنی ہستی کو پہچنوانے میں انہی لوگوں کا ہم خیال ہے جو اُس کے ربانی ہونے کا انکار رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس میں صاف طور پر موجود ہے کہ "وید نئے و پرانے رشیوں کے گیت ہیں"۔

(رگ وید ۱۰۱-۲)





**تیسرا پردہ**

کاش وُہ افراد جن کی طرف ان ویدوں کی تصنیف کی نسبت دی جا سکتی ہے اُن کے نفسانی اوصاف اور اخلاقی کمالات ہی پر ایسی مسلمہ شہادتیں موجود ہوتیں جو اُن کے کلمات کے سر اور آنکھوں پر رکھنے کی سند ہو سکتیں لیکن افسوس ہے کہ ان ویدوں کے مصنفین کا ذاتی تقدس و اعتبار بھی کوئی مسلمہ حیثیت نہیں رکھتا بلکہ "مہا بھارت کا دھارمک اتہاس" ص۱۱۸ میں تو یہاں تک ہے کہ "تینوں ویدوں کے بنانے والے ٹھگ چور اور شیطانی خصلت راکشس تھے۔

**چوتھا پردہ**

وید کی حیثیت جو ابتداء میں تھی وُہ ایک ہی صُورت پر محفوظ بھی نہیں رہی بلکہ اُس میں حسب دلخواہ تصرفات ہوتے رہے جن کی بناء پر یا تو وُہ کتابیں بالکل بدل گئیں اور یا اُن میں جا بجا حسب دلخواہ اضافہ ہو گیا۔

چنانچہ "مہا بھارت کا دھارمک اتہاس ص۱۲۱ میں ہے۔ "جینیوں کی کتابوں میں اس امر کا ثبوت پایا گیا ہے کہ اصل وید اور ہی تھے۔ بعد کو لوگوں نے نئے نئے وید بنا کر اُن میں بہت سی حیوانی قربانیوں کا ذکر کر کے اُن کی خوب اشاعت کی"۔

ص۱۲ "آتما رام جینی کا بھی قول ہے کہ پُرانے چار وید جین دھرم کو تسلیم تھے مگر جب سے برہمنوں نے ان میں ملاوٹ کر دی تب سے وُہ غیر معتبر کر دیئے گئے۔

ص۲۷ "ویدک دھرم کی پہلی تواریخی حالت کی نسبت رگوید ہی سب سے زیادہ مستند ہو سکتا ہے"۔

ص۳۸ "ساتھ ایک بات اور بھی ہے تمام رگوید سے ایک ہی وقت کا دھرم بھی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ نسبتاً اس کا بھی کوئی کوئی حصّہ نیا اور پُرانا ہے۔

**پانچواں پردہ**

وید کے تعلیمات کسی محدود زمانہ کے لیے نہیں بلکہ غیر محدود تھے اس کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے جب کہ ہندوؤں کی کتابوں میں یہاں تک موجود ہے کہ "اس وقت وید بلا زہر کے سانپ کے مانند بے اثر ہے۔ اس وقت وید منتر بلا جان کے جانوروں کی طرح مُردہ ہیں۔

منتر دیوار پر کشیدہ پتلیوں کے مانند ہیں جیسے اُن پتلیوں کی تصویروں میں بظاہر تمام

حواس نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں بالکل بے حس و حرکت ہوتے ہیں۔ اُسی طرح اس زمانہ میں وید منتر بھی بظاہر تو فائدہ مند معلوم ہوتے ہیں مگر اثر کے لحاظ سے قطعی بے سُود ہیں، جیسے بانجھ عورتوں سے صحبت کرنے میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا اسی طرح فی زمانہ وید منتروں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

(شاستری پری چجے نمبر ۸ صفحہ ۲۷ بحوالہ مہا نروان تنتر)

(مذکورہ بالا مضامین کی اصل عبارتوں کے لیے ملاحظہ ہو پنڈت ستیہ دیو جی کی کتاب، "وید کیا چیز ہے" مطبوعہ جونپور ۱۹۲۶ء)

کیا اتنی کمزوریاں جس کتاب میں پائی جاتی ہوں۔ یعنی جس کی اصل معلوم نہ ہو کہ وُہ کس پر نازل ہُوئی؟ وُہ الہامی ہے بھی یا انسانوں کی بنائی ہُوئی ہے؟ اُس کے بنانے والے پاکباز اور پاک طینت افراد تھے یا بقول بعض ٹھگ چور وغیرہ؟ اور پھر اُس کا سابقہ حیثیت پر باقی رہنا بھی مشکوک ہو جس کی بنا پر اُس کے کسی جزو کے اُوپر یقینی طور پر حکم نہ لگایا جاسکتا ہو کہ وُہ خُدا کا کلام ہے اور ان تمام جہتوں سے معتبر مان لینے کے بعد اُس کے موجودہ زمانے میں قابلِ عمل ہونے پر بھی کوئی دلیل نہ ہو وُہ کسی منظم بااصُول مذہب کے لیے قابلِ عمل اور اقوام عالم کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہو سکتی ہے؟ کیا یہ دیدہ دلیری نہیں تو کیا ہے کہ آریہ اپنے وید مقدس کی کمزوریوں کے باوجود دُنیا کو وید کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اُس پر طرّہ یہ کہ قرآن مجید کے قدس و عظمت پر حرف گیری کرتے ہیں کیا وُہ دُنیا کو ہمیشہ اپنے کُتب کے اندرونی حالات سے بے خبر رکھ سکتے ہیں۔

کیا عالم کی آنکھوں پر غفلت کے پردے اس طرح پڑ سکتے ہیں کہ روشنی و تاریکی میں فرق محسوس نہ ہو؟ درحقیقت وید کی تاریخ اس حد پر تخیلات و توہمات سے ڈھکی ہُوئی ہے کہ اُس میں سے ایک ذرہ بھی حقیقت کا دریافت ہونا دشوار نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

## قرآن کریم کی امتیازی خصوصیات

مذکورہ بالا کتب کے مقابلہ میں جب ہم اسلامی کتاب "قرآن کریم" پر نظر ڈالتے ہیں تو





وُہ ان تمام کمزوریوں سے بلند نظر آتی ہے جن کے باعث سے توریت یا انجیل یا وید کے اعتبار کو صدمہ پہنچا ہے بلکہ اُس کی تاریخ ایسے خصوصیات پر مشتمل ہے جو اُس کے استناد و اعتبار کے ضامن ہیں۔

**پہلی خصوصیّت** اُمتِ اسلامیہ کہ جو قرآن مجید کی امانت دار اور اُس کی حفاظت و نگہداشت کی براہِ راست ضامن سمجھی جاسکتی ہے وُہ حقیقی معنی میں باختلافِ زمانہ اُس کے صحیح تعلیمات سے کتنی دُور ہو گئی ہو اور اس کی بنا پر اہل معنی اُس پر ارتداد کا حکم لگا دیں لیکن ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ اُس نے ظاہر بظاہر قرآن کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑا ہو اور اسلام کے اصُول اساسی کو چھوڑ کر کفر و شرک اختیار کیا ہو بلکہ جس وقت سے مسلمانوں نے دُنیا کے وجود میں قدم رکھا اُن کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی رہی اور وُہ برابر اسلام کو اپنا نشانِ قومیت اور قرآن کو اپنا طرّۂ دستار بنائے رہے۔

گذشتہ چودہ سو سال میں تاریخ کسی ایسے وقت کا پتہ نہیں دے سکتی جس میں مسلمانوں نے قرآنِ مجید سے رُوگردانی اور اسلام سے کنارہ کشی کی ہو۔

**دُوسری خصوصیّت** قرآن مجید کے متعلق ابتدا ہی سے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی کہ اس کا نسخہ کسی خاص شخص یا جماعت کے پاس محدود ہے بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو یہ حق حاصل رہا کہ وُہ اسے لکھیں نقل کریں اور از بر یاد کریں رسالت مآبؐ کی حیات میں آیتیں جو متفرق طور پر نازل ہوتی رہتی تھیں وُہ فوراً اصحاب کے گوش گزار کر دی جاتی تھیں اور برابر مختلف صحابہ اُن آیتوں کو جو اُن تک پہنچتی تھیں، اپنے پاس لکھتے رہتے تھے اور اس طرح اگرچہ قرآن مجید ایک کتاب کی صورت میں جمع نہ ہُوا ہو لیکن کافی ذخیرہ اُس کا کثیر التعداد اشخاص کے پاس مکتوبی صورت میں یا سینوں کے اندر محفوظ تھا۔

عوض اس کے کہ کوئی پابندی عائد ہوتی برابر جناب رسالت مآبؐ کی جانب سے قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو حفظ کرنے کی ہدایت ہوتی تھی۔ اطراف و جوانب میں قرآن کی تعلیم کے لیے لوگ روانہ کئے جاتے تھے اور قرآن کا زیادہ مقدار میں علم رکھنے والے کے لیے مخصوص

امتیازات مقرر تھے۔ حضرت رسولؐ کے انتقال کے بعد بھی یہ صورت قائم رہی اور حضرت عمر نے نمازِ تراویح کی ایجاد کرکے حفظِ قرآن کی اہمیت میں ایک باب کا اضافہ کر دیا اور اب پورا قرآن نمازوں میں ختم کیا جانے لگا اور جتنا اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اتنا قرآن مجید کے نسخ میں اضافہ ہوا اور دُور دُور کے شہروں تک قرآن کے نسخے نقل کرا کر بھیجے گئے یہاں تک کہ بوقت واحد ہزارہا نسخے دُنیا کے طول و عرض میں نظر آنے لگے۔ اس طرح ان توہمات کا بالکل قلع قمع ہو گیا جو توریت و انجیل کے اندر یہود و نصاریٰ کی سینکڑوں برس تک پردہ داری نے پیدا کر دیئے تھے۔

### تیسری خصوصیّت

قرآن مجید اپنی اصلی زبان (عربی) میں موجود ہے اور صرف موجود نہیں بلکہ ہر مسلمان قرآن صرف اسی کو سمجھتا ہے جو مخصوص الفاظ پر مشتمل ہے ان کے شرعی احکام بھی اسی قرآن سے تعلق رکھتے ہیں نماز میں اس کا پڑھنا لازم اور دیگر مواقع پر اُسی کی تلاوت اجر و ثواب کا باعث قرار دی گئی ہے، رہ گئے تراجم وہ صرف ناواقف افراد کے لیے معانی سمجھنے کا ذریعہ ہیں، قرآنی احکام سے اُن کو کوئی تعلق نہیں برخلاف تورات و انجیل کے کہ انجیل متی کا تو اصلی زبان والا نسخہ ہی دُنیا میں موجود نہیں ہے اور دُوسرے اناجیل و کتب عہدین اگرچہ اصلی زبانوں میں موجود ہیں لیکن خود اُن کے ماننے والے اُن کے الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس لیے ہر سال ہزاروں زبانوں میں اُن کے ترجمے شائع ہوتے ہیں اور عیسائی مبلغین ہر عیسائی جماعت میں داخل ہونے والے کو اُسی زبان کی انجیل و تورات دیتے ہیں جس کا وہ جاننے والا ہے۔ رہا عبرانی نسخہ تورات و انجیل کا تو اُس کی عام طور پر مسیحی افراد پڑھنا تو درکنار صورت تک نہیں دیکھتے۔

### چوتھی خصوصیّت

قرآن مجید کے آیات کو متفرق طور پر خود رسالت مآبؐ بوقت ورود ہی قلمبند کرا لیا کرتے تھے اور پھر اُن متفرق آیات کو بعد حضرت کی وفات کے جمع کیا ایسے افراد نے جو حضرت کی صحبت میں بیٹھے ہُوئے اور حضرت کے مدرسۂ فیض کے تعلیم یافتہ تھے اور اس طرح وُہ کمزوری جو اناجیل میں اس طرح پیدا ہو گئی کہ اُن کے لکھنے والوں میں سے بیشتر افراد نے عیسٰی کی صُورت بھی نہ دیکھی تھی، قرآنِ کریم میں پائی





نہیں جاتی۔

### پانچویں خصوصیّت

قرآن مجید کی ابتدا، انتہا اُس کا اسلوب اور طریقۂ بیان سب اُس کے کلامِ الٰہی اور منزل من اللہ ہونے کا منادی ہے وُہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ کی تاریخ زندگی نہیں ہے جس میں اُن کی ولادت سے لے کر وفات تک کے تفصیلی حالات کا تذکرہ ہو اور نہ اُس میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہے جو رسُولؐ کی وفات یا اس کے بعد سے تعلق رکھتے ہوں جن کی بنا پر اُس کے رسُولؐ پر نازل ہونے میں شبہ کیا جائے اور نہ اُس میں غیرِ خُدا کسی کی زبان سے اس قسم کے فقرات ہیں کہ اس کو میں نے مستند راویوں کے کلام سے اخذ کر کے لکھا ہے اور نہ وُہ واقعات ہیں جنھیں کسی صحابی نے چشم دید مشاہدہ کی بنا پر نقل کیا ہے جس کا نمونہ ہم عیسائیوں کے اناجیل میں دکھلا چکے ہیں بلکہ اس میں ہر ہر جملہ اس خصوصیت کا خزینہ دار ہے کہ وُہ خُدا کی جانب سے نازل شدہ کلام ہے۔ اُس نے إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وغیرہ آیات میں اُس کے تنزیل من اللہ کا صراحت کے ساتھ اعلان کیا اسی طرح اُس میں ہر موقع پر ماضی و حال کے واقعات میں توازن کو ملحوظ رکھ کر اپنے زمانۂ نزول کی تعیین میں واہمہ پردازیوں کا سدِباب کر دیا اُس نے رسُولؐ کی وفات کا بھی تذکرہ کیا ہے تو اس طرح کہ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وُہ رسُولؐ کی زندگی کا کلام ہے نہ یہ کہ وُہ انجیل کی طرح رسُول کی وفات کے گذشتہ واقعہ ہونے کی بنا پر اس پر نوحہ سرائی کے لیے بیٹھ جاتا جو اُس کے رسُول کے بعد نوزائیدہ ہونے پر قطعی دلیل تھا۔

### چھٹی خصوصیّت

قرآن مجید کی اصلیت و حقیقت کے متعلق مسلمانوں کے اندر باوجود آپس کے ہزارہا گوناگوں اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ وُہ متفقہ حیثیت سے اس نقطہ پر مجتمع ہیں کہ قرآن مجید خداوند عالم کا نازل کردہ رسُولِ عربی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل شدہ ہے اور یہ کہ اُس میں کسی انسان کی ساخت و پرداخت کو کوئی دخل نہیں ہے اس طرح وید میں اس کے ماننے والوں کے ایک نقطہ پر مجتمع نہ ہونے کی حیثیت سے جو کمزوری پائی جاتی ہے اس سے قرآن مجید پاک و منزہ ہے۔

## ساتویں خصوصیت

قرآن مجید کے متعلق اُس کے ماننے والے اس امر پر متفق ہیں کہ وُہ دُنیا کے آخری نقطہ تک کے لیے رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے اور یہ کہ وُہ کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہے۔ اس کے تعلیمات دُنیا میں بقاء و دوام کے مالک ہیں اور اُس کے ہدایات زمانہ کے ہر جزو کے لیے مساوی طور پر فائدہ مند ہیں اور اس طرح وُہ ہر زمانہ میں خود بھی اپنی طرف دعوت دیتا ہے اور اس کے معتقدین کے لیے بھی عالم بھر کو اس کی طرف دعوت دینے کا حق ہے۔

## آٹھویں خصوصیت

یہ قرآن جب سے عالم وجود میں آیا۔ اس کے ہر ہر لفظ اور ہر جملہ کی جانچ پڑتال ہوتی رہی اور ذمہ دار افراد کی توجہ اس کی کتابت و حفظ کے سلسلہ میں اصلی الفاظ کی نگہداشت اور معمولی سے معمولی خصوصیت حتیٰ اعراب و طریق ادا، وغیرہ کے متعلق ذرہ بینی پر منعطف رہی اور اس طرح قرآن مجید میں کسی غیر معلوم تصرف یا تحریف کا امکان باقی نہیں رہا جو اُس کے سند و اعتبار کو صدمہ پہنچانے کا باعث ہو۔

# قرآن کریم آپ اپنا معیار ہے

اربابِ قلم کی علمی و ادبی شاہکاریں جو کسی پہلو سے امتیاز کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اُن میں قلم کا رنگ ڈھنگ اہلِ نظر کی نظر کو ایک خاص پیمانہ کا عادی بنا کر اُن کی قوتِ ادراک کو امتیاز کا جوہر دے دیا کرتا ہے جس کی بنا پر ایک نادیدہ عبارت بھی اُن کے سامنے پیش ہو تو وُہ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ یہ اُس کتاب یا مضمون کا جزو ہے یا نہیں چہ جائیکہ قرآن مجید جو اپنے مخصوص طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان میں اس امتیاز کو لے کر دُنیا کے سامنے آیا تھا جس نے عالمِ انسانیت کے ہر جزو و کل کو اپنے معارضہ کی دعوت دے کر اُن سے عجز کا اعتراف کرا لیا اور جس کے سامنے تمام قوائے عمل اور انسانی ذرائع و اسباب نے اپنی شکست کا اقرار کر کے اُس کی کامل فتحیابی کی تصدیق کر دی۔ اُس نے زیادہ سے زیادہ مطالبہ میں پوری کتاب اور کم سے کم میں اپنے مختصر ترین سورہ کو پیش کر کے دعوائے یکتائی کیا اور زمین و آسمان کی درمیانی فضا نے صدیاں گزرنے کے بعد بھی ساکن رہ کر اپنے خاموش نغموں سے اُس کے دعوے کی





گواہی دی اُس کا مخصوص طرزِ بیان و طریقۂ ادا صرف آیات کے فصل و وصل اور اُن کے اختتامی فواصل میں منحصر نہیں ہے جس کا تتبع ایک انشا نگار کے لیے دشوار نہ ہو ورنہ علی محمد باب کی کتاب البیان اور مرزا غلام احمد قادیانی کی حمامۃ البشریٰ و خطبہ عید الاضحیٰ میں اس جوہر کی کمی نہیں ہے بلکہ وُہ اس کے الفاظ کی نشست اور جملوں کے جوڑ پیوند اور عبارات کی ساخت و پرداخت اور الفاظ و معانی کے مخصوص توازن و تناسب میں اس حیرت انگیز پیرایہ کا نام ہے جس نے غیروں کو جادو اور اپنوں کو معجزہ کہنے پر مجبور کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب فصیح سے فصیح عبارت میں قرآن مجید کا ایک جملہ آجاتا ہے تو وُہ اس طرح نمایاں ہوتا ہے جیسے سنگریزوں میں موتی اور نہیں تو ستاروں میں ماہتاب اور اس بنا پر کسی ایک جزوِ کلام کے متعلق جس میں جزوِ قرآن ہونے کا شبہ ہو یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ حقیقتاً وُہ قرآن کا جزو ہے یا نہیں۔ انہی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ قرآن خود آپ اپنا معیار ہے۔

اگر درایت کوئی چیز ہے اور روایت کا درایت پر انطباق عقلی بنیاد پر ضرور ہے تو کسی راوی کا قول کہ فلاں سُورہ یا آیت قرآن کا جزو تھا، اُس وقت تک قابلِ اعتماد نہیں جب تک وُہ خود اپنے جزوِ قرآن ہونے کی گواہی نہ دے رہا ہو اور اس طرح خواہ اہلِ سنّت کا روایتی سورۂ حفد و خلع ہو یا بعض شیعوں کا سورۂ ولایت کسی صُورت پر جزوِ قرآن تسلیم نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ جب اس کو مسلّمہ آیاتِ قرآن کے پہلو میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو وہی نسبت معلوم ہوتی ہے جو سنگریزوں کو گوہرِ شاہوار سے۔

اور اس طرح اکثر اُن آیات کی بھی حقیقت کُھل جاتی ہے جن کے متعلق رطب و یابس جمع کرنے والے محدّثین نے جزوِ قرآن ہونے کے روایات نقل کر دیئے ہیں۔

یہ نویں خصوصیت ہے قرآن مجید کی جو اُس کے علاوہ دُوسری آسمانی کتابوں میں نہیں پائی جاتی کیونکہ اُن کتابوں میں کوئی قدر متیقن یعنے تعین کے ساتھ یقینی جزو موجود ہی نہیں ہے جس کو ہم شک و شبہ کی صُورت کا معیار قرار دیں برخلاف قرآن مجید کے کہ وُہ یقینی حیثیت سے اتنا کہ جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے باتفاقِ کل اور روایت و درایت دونوں کے اعتبار سے خدا کا کلام ہے اور وہی مشکوک و مشتبہ صورتوں کے لیے معیار بننے کی صلاحیت

رکھتا ہے پھر دوسری کتابوں میں لفظ و معنی اور اندازِ بیان کے اعتبار سے کوئی ایسی خصوصیت بھی مضمر نہیں ہے جو کسی دُوسرے کلام کو اُس سے لگاؤ نہ رکھنے دے لیکن قرآن مجید وُہ اپنے ذاتی خصوصیات کی بنا پر خود اپنا معیار بننے کے قابل ہے اور اس طرح وُہ خود بے اصل توہمات کا سدِّباب اور بے بات کی بات بنانے والوں کی زبان بندی کے لیے کافی ہے

## سند حجّیت یا میزانِ اعتبار

زمانہ کے اجزاء اپنے حوادث سمیت گذرنے والے ہیں اور اس میں پیدا ہونے والی مخلوق سلسلۂ تدریج کی پابند ہے اور اس لیے آخر میں پیدا ہونے والی نسلیں اولین اسلاف کے برکات سے اُس وقت تک بہرہ مند نہیں ہو سکتیں جب تک وسطی حلقے امانت داری کے ساتھ اُن کے پس انداز جواہر کو خود محفوظ رکھ کر اُن کے سپرد نہ کریں۔ یوں ہی آخر کی کڑی اوّل سے اور مستقبل کا سلسلہ ہزاروں برس قبل کے ماضی بعید سے متصل ہو جاتا ہے گزشتہ مصنفین کے علمی و ادبی جواہر پارے یوں ہی مسلم حیثیت سے موجود پائے جاتے ہیں کہ مستند رواۃ اور معتمد ناقلین نے دست بدست ان کی نگہداری کرکے امانت کے فرض کو انجام دیا ہے اور باخبر افراد نے اُن کے انتساب کی مسلمہ طور پر تصدیق کرکے اس میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے۔

یہی تواتر جو کثیر التعداد راویوں کے متفقہ بیانات سے یقینی طور پر ثبوت بہم پہنچنے کا نام ہے کسی کتاب کے یقینی حیثیت سے صحت و اعتبار کا ضامن ہے لیکن اس کے بعد بھی وُہ کتاب اس وقت مشکوک ہو جائے گی جب مسلمہ شہادات سے اس کا منحرف ہونا ثابت ہو جائے گا اس طرح کہ اس کے ہر ہر جزو میں احتمال زیادتی و کمی کا پیدا ہو یعنی اجمالی طریقہ سے اس امر کا علم ہو کہ اُس میں کچھ زیادتی ہُوئی ہے یا ایسی کمی جس نے اس کے مطلوبہ اغراض و مقاصد پر اثر ڈال کر اس کو ناقص بنا دیا ہے۔

اس صورت میں اس کا ہر جزو شک و شبہ کا مرکز بن جائے گا اور کسی جزو پر بھی اس کے یقینی طور پر حکم نہ لگایا جا سکے گا کہ وُہ اصل کتاب کا جزو ہے لہٰذا مجموعِ کتاب کے ساتھ اس کے





ہر جزو پر بھی اعتماد پیدا ہونے کے لیے دو باتوں میں سے کسی ایک بات کی ضرورت ہے۔

(۱) مستند وجوہ کی بنا پر اُس کے کسی جزء میں بھی زیادتی و کمی کے شبہ کا سدِّباب ہو گیا ہو اور اس میں کسی ایک کلمہ کے بھی زیادہ و کم ہونے کا ثبوت نہ ہو۔

(۲) اگر اس امر کا یقین ہو کہ اُس میں کہیں زیادتی یا کمی ہوئی ہے تو مستند وجوہ کی بنا پر اُس زیادتی و کمی کے مقامات اور اُن کی نوعیت کا علم ہو گیا ہو اور بقیہ حصّہ کے متعلق کوئی ضمانت ہو جو اُس کی حجیت و اعتبار کی قطعی طور پر دستاویز بھی جا سکے۔

اسی طرح اس کتاب پر اعتقاد رکھنا حق بجانب اور اس پر عمل کرنا صحیح و جائز ہو گا۔

ایمان بالقرآن کے اگر صرف یہ معنی ہوں کہ حقیقی کتاب جو رسُولؐ نے قرآن کریم کے نام سے پیش کی تھی وُہ یقیناً خدا کا کلام اور سچّا معجزہ ہے تو اس کے لیے موجودہ اجزاءِ قرآن میں کسی بحث و تحیص کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسا ایمان مسلمانوں کو توریت و انجیل اور دیگر کتبِ سابقہ پر بھی لازم ہے باوجودیکہ اُن کا وجود دُنیا میں باقی نہیں اور جو موجود ہیں وُہ حقیقی توریت یا انجیل کہنے کے قابل نہیں ہیں لیکن اگر ایمان بالقرآن کے معنی یہ ہیں کہ موجودہ اجزائے قرآن پر جو بین الدفتین موجود ہیں اعتقاد رکھ کر اُس کے کلامِ خُدا اور اُس کے ہر جزو کے مستند اور واجب العمل ہونے کا یقین رکھیں اور یہ ایک مخصوص امتیاز ہو جو تمام کتبِ سابقہ کے مقابلہ میں قرآن مجید کو حاصل ہے تو اس ایمان بالقرآن کے لیے ضرورت اسی بات کی ہے کہ اس میں تحریف و تبدیل کے احتمال کا سدِّباب ہو جائے یا اُن موارد کی تعیین ہو جن میں نقص و زیادتی کا شبہ ہے اور بقیہ حصّہ کے متعلق ایسے وجوہ ہوں جو اس کے اعتبار و استناد کی قطعی دلیل سمجھے جا سکتے ہیں۔

## قرآنِ کریم کی نسبت فریقین کا زاویۂ نگاہ، تحریفِ قرآن کے روایات؛ اور ان کا سند و اعتبار کے معیار سے تطابق، ایمان بالقرآن کی اصلیت اور طرفین کے مذہبی اصول کا توازن، قرآن کے متعلق سنّی نقطۂ نظر

مذکورۂ بالا اصول اور میزانِ اعتبار کی بناء پر جب ہم عام اسلامی جماعت کے اُن

محدثین و مؤرخین کے بیانات پر نظر ڈالتے ہیں کہ جو اپنے تئیں ایمان بالقرآن کا واحد ٹھیکہ دار بنا کر دوسروں پر ایمان بالقرآن نہ رکھنے کا الزام عائد کرتے ہیں تو ان بیانات میں ایسی کمزوریاں نظر آتی ہیں جن سے قرآن مجید کے تواتر اور اس کے صحت و اعتبار میں طرح طرح کے شبہ پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ اور اگر انھیں صرف انہی محدثین و رواۃ کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو کسی صورت سے ایمان بالقرآن کا دعویٰ حق بجانب معلوم نہیں ہوتا۔

## جمع قرآن کی کیفیت

اس سلسلہ میں حسب ذیل واقعات مستند کتب احادیث و سیر میں درج پائے جاتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید جناب رسالتمآبؐ کے زمانہ میں اگرچہ متفرق طور پر قلمبند ہو چکا تھا لیکن کتاب کی صورت میں اس کی جمع و تدوین نہ ہوئی تھی جس کی تصریح ائمہ فن کے حسب ذیل بیانات میں صاف طور پر پائی جاتی ہے۔ قال الدیر عاقولی فی فوائدہ حدثنا ابراھیم بن بشار حدثنا سفیان بن عیینۃ عن الزھری عن عبید عن زید بن ثابت قال قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یکن القران جمع فی شی ء۔

"دیر عاقولی نے اپنی سلسلہ وار سند سے خود زید بن ثابت جامع قرآن کی زبانی نقل کیا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے انتقال کیا ایسی حالت میں کہ قرآن یکجا صورت سے جمع نہیں ہوا تھا"
(اتقان سیوطی ج ۱ ص۵۸)

اور خود حافظ سیوطی نے مسلم کی ایک حدیث کی توجیہ کرتے ہوئے اس کا مسلمہ حیثیت سے اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے۔

"قد کان القران کتب کلہ فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکن کان غیر مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السور" قرآن عہدِ رسولِ امینؐ میں پورا مرتب ہو چکا تھا لیکن وہ ایک جگہ پر جمع نہ تھا اور نہ اس کے سورے مرتب تھے۔
(اتقان ص۵۹)

خطابی نے اس مسلمہ حقیقت کی اپنے مذاق پر توجیہ بھی کی ہے جس کو علامہ سیوطی حسب ذیل الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔





قال الخطابی انما لم یجمع القران صلی اللہ علیہ وسلم فی المصحف لما کان یترقبہ من ورود ناسخ بعض احکامہ وتلاوتہ۔

حضرتؐ نے قرآن مجید اس لیے مصحف میں جمع نہیں کیا تھا کہ آپ کو خیال تھا شاید کوئی حکم یا آیت اس کی منسوخ ہو جائے۔ (ص۵۸)

بیہقیٔ ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی ازالۃ الخفاء میں تحریر فرماتے ہیں۔ "قرآن تا آخر زمان آنحضرتؐ مجموع در مصاحف نبود"

اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی تفسیر حقانی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔ آنحضرتؐ نے اپنی حیات میں تمام قرآن لکھوا کر ایک جلد میں جمع نہیں کیا ہے (ص۸۳)

(۲) حضرت رسولؐ کی وفات کے بعد فوراً ہی عام طور پر صحابہ کرام نے جمع قرآن کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ ان اشخاص پر اعتماد رہا جو متفرق طور سے اپنے سینوں کے اندر قرآن کے آیات اور سوروں کو محفوظ کئے ہوئے تھے اس کے بعد جب فتنۂ ارتداد نے زور پکڑا اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یمامہ کی جنگ میں کثیر جماعت حفاظ میں سے قتل ہو گئی اس وقت حضرت عمرؓ کو قرآن مجید کے جمع و تالیف کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے لیے زید بن ثابت کو منتخب کیا گیا اور اس کا تذکرہ صحیح بخاری "باب جمع القرآن" میں حسب ذیل صورت سے موجود ہے۔

ان زید بن ثابت قال ارسل الیّ ابو بکر مقتل اھل الیمامۃ فاذا عمر بن الخطاب عندہٗ فقال ابو بکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامۃ بقراء القران وانی اخشی ان یستحر القتل بالقراء بالمواطن فیذھب کثیر من القران وانی اری ان تامر بجمع القران قلت لعمر کیف تفعل شیئا لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال عمر ھذا واللہ خیر فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذلک ورایت فی ذلک الذی رای عمر قال زید قال ابو بکر انک رجل شاب عاقل لا نتھمک وقد کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتتبع القران فاجمعہ فواللہ لو کلفونی نقل جبل من جبال

ما کان اثقل علیّ مما امرنی بہ من جمع القرآن قلت کیف تفعلون شیئاً لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھو واللہ خیر فلم یزل ابوبکر یراجعنی حتّٰی شرح اللہ صدری للذی شرح لہٗ صدر ابی بکر وعمر فتتبعت القرآن اجمعہٗ من العسب واللخاف وصدور الرجال حتی وجدت اٰخر سورۃ التوبۃ مع ابی خزیمۃ الانصاری لم اجدھا مع احد غیرہٖ لقد جآءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم حتّٰی خاتمۃ البراءۃ فکانت الصحف عند ابی بکر حتّٰی توفاہ اللہ ثم عند عمر حیاتہٖ ثم عند حفصۃ بنت عمر۔

زید بن ثابت کا بیان ہے کہ مجھ کو حضرت ابوبکر نے اہلِ یمامہ کے قتل ہونے کے بعد بلوا بھیجا، وہاں عمر بن خطاب بھی موجود تھے۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ بھئی عمر میرے پاس آئے اور اُنھوں نے کہا کہ یمامہ کی جنگ میں حفاظِ قرآن کا ستھراؤ ہوگیا ہے اور مجھے خوف ہے کہ یونہی دو تین لڑائیوں میں اگر حفاظ قرآن مارے گئے تو قرآن مجید کا کثیر حصّہ ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآنِ مجید کے یکجا جمع کئے جانے کا حکم دیجئے، مَیں نے یہ سُن کر اُن سے کہا کہ بھلا ایسی بات کیونکر کر سکتے ہو جس کو رسالت مآبؐ نے نہیں کیا تھا؟ عمر نے کہا کہ یہ بات تو خدا کی قسم اچھی ہی اچھی ہے۔ اس کے بعد سے برابر عمر مجھ سے اس امر میں تبادلۂ خیالات کرتے رہے یہاں تک کہ خدا نے میرے دِل کو اس امر کے لیے کشادہ کر دیا اور میری بھی رائے ان کی رائے کے موافق ہوگئی۔

(پھر زید بن ثابت کو مخاطب کر کے) تم تو عمر جواں سال اور عقلمند آدمی ہو اور تم پر ہمیں اعتماد بھی ہے اور تم حضرت رسُولؐ کے لیے وحی کے کاتب بھی رہ چکے ہو۔ لہٰذا تم قرآن مجید کو مختلف مقامات سے تتبع کر کے جمع آوری کے کام کو انجام دو۔

(زید کا بیان ہے) یہ سُننا تھا کہ میرے حواس اُڑ گئے۔ خدا کی قسم اگر مجھ سے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ لے جانے کو کہا جاتا تو وُہ میرے اُوپر اتنا ہی گراں ہوتا جتنا کہ اُس وقت یہ جمع قرآن کا حکم گراں تھا مَیں نے کہا کہ آخر آپ لوگ ایسی بات کیونکر کریں گے، جو رسالت مآبؐ نے نہیں کی تھی، حضرت ابوبکر نے کہا یہ تو مفید کام ہے اور اس میں اچھائی ہی





اچھائی ہے، اس کے بعد بار بار حضرت ابوبکر مجھ کو ٹوکتے رہے یہاں تک کہ مَیں بھی حضرت ابوبکر و عمر کا ہم خیال ہوگیا اور مَیں نے قرآن مجید کو درخت کی چھالوں اور پتھر کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے کہ جن میں اُس کی متفرق آیات محفوظ تھیں، جمع کرنا شروع کیا یہاں تک کہ سورۂ توبہ کا آخری حصّہ لقد جآءکم رسول من انفسکم الخ مجھ کو صرف ابوخزیمہ انصاری کے پاس موجود ملا۔ یہ جمع شدہ صحیفے حضرت ابوبکر کے پاس رکھے گئے اور اُن کے بعد حضرت عمر اور پھر حفصہ بنت عمر کی طرف منتقل ہُوئے۔ (بخاری مطبوعہ کرزن پریس دہلی ص۷۴۵)

حضرت ابوبکر کے اس فقرہ سے کہ کیف تفعل شیئاً لم یفعل رسول اللہؐ اور اسی طرح زید بن ثابت کے کہنے سے کہ کیف تفعلون شیئاً لم یفعلہ رسول اللہؐ۔ صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید رسالتمآبؐ کے زمانہ میں جمع نہ ہُوا تھا اور اب اس کے مقابلہ میں حاکم کی اس روایت کا وزن باقی نہیں رہتا کہ قرآن جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ میں جمع ہو چکا تھا اور یہ کہ زید بن ثابت کا بیان ہے کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع "ہم حضرت رسُولؐ کے زمانہ میں قرآن مجید کو مختلف کاغذ کے پرزوں سے جمع کرتے تھے جب کہ امام بخاری کی روایت اس کے خلاف ہے اور پھر زید کی یہ روایت صریحی طور سے اس امر کو بتلاتی بھی نہیں کہ قرآن کے اجزاء کتاب کی صُورت میں یکجا جمع کیے جاتے تھے چنانچہ حافظ سیوطی نے اس روایت کو نقل کرنے پر امام بیہقی کی توجیہ نقل کر دی ہے کہ یشبعان یکون المراد بہ تالیف ما انزل من الاٰیات المتفرقۃ فی سورھا وجمعھا فیھا باشارۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قریبی احتمال یہ ہے کہ اس جمع و تالیف سے متفرق آیات کو مقررہ سوروں کے آیات کے ساتھ ملا کر یکجا کرنا مُراد ہو جس کا رسالتمآبؐ نے حکم دیا تھا۔ (اتقان ج ۱ ص۶۰)

دُوسری بات جو بخاری کی حدیث سے صاف طور پر ثابت ہے وُہ یہ کہ قرآن مجید کے جمع و تالیف کا کام صرف ذاتی اعتماد کی بنا پر انفرادی حیثیت سے زید بن ثابت کے سپرد کر دیا گیا تھا اور اس بنا پر زید بن ثابت نے جتنی بھی چھان بین کی ہو اور جس کد و کاوش سے بھی اُس کو جمع کیا ہو لیکن مجموعی حیثیت سے اُس کی صحت و اعتبار کا انحصار زید بن ثابت

امانتداری و وثاقت پر رہ جاتا ہے۔

اور پھر زید بن ثابت کا یہ بیان کہ "میں نے قرآن مجید کو متفرق درخت کی چھالوں اور پتھر کے ٹکڑوں اور مختلف لوگوں کے محفوظات کا تتبع کر کے جمع کیا" اس امر کی صریحی دلیل ہے کہ قرآن مجید اس وقت مجموعی حیثیت سے کسی شخص کو بھی صحابہ میں سے یاد نہ تھا ورنہ اتنی زحمت برداشت کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

(۳) زید بن ثابت کا انتہائی اہتمام یہ تھا کہ وُہ کسی آیت کو اس وقت تک درج نہ کرتے تھے جب تک دو عادلوں کی گواہیاں حاصل نہ ہوتی تھیں چنانچہ علامہ سیوطی لکھتے ہیں قد اخرج ابن اشتہ فی المصاحف عن لیث بن سعد قال اول من جمع القران ابو بکر وکتبہ زید بن ثابت وکان الناس یاتون زید بن ثابت فکان لا یکتب اٰیۃ الا بشاھدی عدل وان اٰخر سورۃ البراءۃ لم توجد الا مع خزیمۃ بن ثابت فقال اکتبوھا فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعل شہادتہ بشہادۃ رجلین فکتب وان عمر اتی باٰیۃ الرجم فلم یکتبھا لانہ کان وحدہ۔

ابن اشتہ نے کتاب المصاحف میں لیث بن سعد کی زبانی نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے قرآن کو جمع کیا وُہ حضرت ابوبکر ہیں اور زید بن ثابت اس کے لکھنے والے تھے اور لوگ زید بن ثابت کے پاس (قرآن کی آیتوں کو) لے کر آتے تھے مگر وُہ کوئی آیت نہ لکھتے تھے جب تک کہ دو عادل شخص اس کی گواہی نہ دے دیتے تھے اور سُورۂ برأت کا آخری حصّہ صرف خزیمہ بن ثابت کے پاس دستیاب ہُوا تو وُہ صرف اُنہی کی گواہی پر لکھوا لیا گیا اس لیے کہ ان کی گواہی کو جناب رسالت مآبؐ نے دو گواہیوں کے برابر قرار دیا تھا اور حضرت عمرؓ آیہ رجم کو لے کر آئے تو اُس کو درج نہیں کیا گیا اس لیے کہ وُہ تنہا تھے۔ ان کے موافق کوئی دُوسرا گواہ نہ تھا۔ (اتقان ج ۱ ص۶۰)

اس روایت سے بے شک زید بن ثابت کی کدوکاوش کا اندازہ ہوتا ہے لیکن کیا اس صورتِ حال نے قرآن مجید کی عظمت میں کوئی اضافہ کیا یا اس کو محفوظ رکھا؟ کیا اس کے آیات میں شاہدین عدلین کی گواہی کی ضرورت اس کے مسلّم شان تواتر کو صدمہ نہیں پہنچاتی؟ کیا وہ





صحابہ جن کے اقوال کو کسی دُوسرے کی گواہی نہ ہونے کے سبب سے رد کر دیا گیا۔ یقیناً دروغ گو اور افترا پرداز تھے؟ تو پھر عدالت صحابہ کے عقیدہ کا کیا حشر ہوگا؟ اور جب وُہ یقینی طور پر کاذب نہیں ہیں تو کیا اس امر کا یقین اور کم سے کم شبہ نہیں پیدا ہوتا کہ اُن صحابہ کی بتلائی ہُوئی آیتوں میں معتد بہ تعداد حقیقی آیاتِ قرآن کی تھی جو اس قرآن میں درج ہونے سے رہ گئیں۔

بعض روایتوں میں زید بن ثابت کا قدم درمیان سے نکال دیا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق خود بنفس نفیس جمع قرآن کے انتظام میں مصروف تھے چنانچہ علامہ سیوطی لکھتے ہیں اخرج ابن ابی داؤد من طریق یحییٰ بن عبدالرحمن بن حاطب قال قدم عمر فقال من کان تلقی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئا من القران فلیات بہ وکانوا یکتبون ذلک فی الصحف والالواح والعسب وکان لا یقبل من احد شیئا حتی یشہد شہیدان۔

ابن ابی داؤد کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے صحابہ کے مجمع میں آکر اعلان کیا کہ جس کسی شخص نے کوئی حصّہ بھی قرآن کا حضرت رسُولؐ سے حاصل کیا ہو وُہ اس کو لا کر پیش کرے اور وُہ لوگ قرآن کی آیتوں کو کاغذوں، تختیوں اور درخت کی چھالوں پر لکھا کرتے تھے اور حضرت عمر کسی شخص کے دعوے کو قبول نہ کرتے تھے جب تک دو گواہ اُس کی گواہی نہ دیتے تھے۔ (اتقان ج ۱ ص۵۹)

لیکن اس روایت میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت عمر نے آیۂ رجم کو جو اُن کی نظر میں یقیناً جزوِ قرآن تھی کیوں درج نہ کیا اس لیے کہ ذاتی علم کے بعد عادلین کی گواہیوں کا انتظار کوئی معنی نہیں رکھتا؟ ہاں مگر یہ کہ حضرت عمر پورے طور پر اس معاملہ میں خود مختار نہ رہے ہوں بلکہ زید بن ثابت ان کے شریک کار قرار دیئے گئے ہوں جیسا کہ تیسری روایت سے ثابت ہوتا ہے جس کو علامہ سیوطی نے حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے۔ واخرج ابن ابی داؤد ایضاً من طریق ھشام بن عروۃ عن ابیہ ان ابا بکر قال لعمر ولزید اقعدا علی باب المسجد فمن جاءکما بشاھدین علی شیء من کتاب اللہ فاکتباہ۔

عروہ بن زبیر کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر نے عمر اور زید سے کہا کہ تم دونوں آدمی

مسجد کے دروازہ پر بیٹھو اور قرآن مجید کی جس آیت پر دو گواہیاں حاصل ہو جائیں اس کو درج کرلو۔ (اتقان ج ۱ صفحہ ۶۱)

بہرحال خواہ پہلی صورت ہو یا دوسری یا تیسری، یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا کہ آیات قرآن کے تسلیم کرنے میں شہادت عدلین کی شرط لگائی گئی تھی اور یہی امر قرآن کی جامعیت میں شبہ پیدا کرنے کا باعث ہے۔

طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امر میں پورا اہتمام تھا کہ قرآن میں کوئی ایسی چیز درج نہ ہونے پائے جو حقیقتاً قرآن کا جزو نہیں ہے لیکن یہ امر اس قدر موردِ اہتمام نہ تھا کہ قرآن کی کوئی آیت رہ جانے بھی نہ پائے ورنہ کسی صحابی کے قول کو صرف اس بنا پر رد نہ کر دیا جاتا کہ اُس کے ساتھ کوئی دوسرا گواہی دینے والا نہیں۔

اب بتاؤ کہ وُہ تمام صحابہ جن کے قول کو انفراد کی بنا پر رد کر دیا گیا تھا اس قرآن کو ناقص سمجھتے تھے یا نہیں جب کہ وُہ صداقت کے ساتھ ایک ایسی آیت کو جزوِ قرآن سمجھتے ہیں جو اس قرآن میں درج نہیں۔

پھر کیا ایک ایسا مسلمان جو قرآن موجود میں زیادتی کا انکار اور اُس کے ہر ہر جزو کے کلامِ خدا ہونے کا اقرار رکھتے ہُوئے کہیں کہیں سے اس کی بعض آیتوں کے متعلق یہ رائے رکھتا ہو کہ وُہ درج ہونے سے رہ گئیں۔ کافر اور غیر مؤمن بالقرآن سمجھا سکتا ہے؟ اور کیا اُس فتوائے کفر کی زد میں بہت سے صحابۂ کرام نہ آجائیں گے؟

### جمع قرآن کے بعد

حضرت ابوبکر نے زید بن ثابت کے ہاتھوں اس صورت سے جس کا تذکرہ ہو چکا قرآن مجید کتابی صورت میں جمع تو کرا دیا لیکن نشر و اشاعت کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ جیسا کہ بخاری کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے وُہ کتاب اُن کے پاس محفوظ رہی اور پھر حضرت عمر نے اس کو اپنے پاس امانت رکھا اور اُن کے انتقال پر ان کی صاحبزادی حفصہ کے قبضہ میں آیا۔ عام مسلمانوں کے لیے وہی صورتِ حال جو اس کے قبل تھی باقی رکھی گئی یعنی مختلف صحابہ قرآن مجید کے متفرق حصّوں کو اپنے سینوں میں اور مکتوبی صورت میں منتشر اجزاء اپنے پاس محفوظ رکھے ہُوئے تھے اور وہی قرآن مجید کی تعلیم کے ذمہ دار اور اُس



نگہداری و حفاظت کے ضامن و متکفل تھے اور اُن میں سے بھی مخصوص صحابہ جو قرآن مجید کو رتب حیثیت میں مکمل طور پر حفظ کیے ہُوئے تھے انھوں نے اپنے اپنے مذاق پر ترتیب ے کر قرآن مجید کو مرتب و مدوّن بھی کیا۔

امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے علاوہ جن کے جمع قرآن پر مبسوط بحث ستقل طور پر کی جائے گی دیگر مستند و مسلم صحابہ جنھوں نے قرآن مجید کو اپنی اپنی ترتیب کے طابق جمع کیا تھا عبداللہ بن مسعود۔ ابی بن کعب۔ معاذ بن جبل تھے اور ابو موسیٰ اشعری نے ی اپنے محفوظات کی بنا پر ایک قرآن جمع کیا تھا جسے اہلِ بصرہ میں مقبولیت حاصل تھی اور وُہ ن کے اندر "لباب القلوب" کے نام سے مشہور تھا۔

(اعجاز القرآن مصنفہ شیخ مصطفےٰ صادق رفاعی مطبوعہ مصر صفحہ ۳۱، ۳۸)

### ختلاف مصاحف

مذکورہ بالا مصاحف جنھیں مختلف اشخاص نے اپنے اپنے محفوظات پر جمع کیا تھا ان میں ترتیب کی حیثیت سے اختلاف تھا جس کی یلی کیفیت ابن اشتہ نے کتاب المصاحف میں اور انہی سے حافظ سیوطی نے اتقان میں ل کی ہے۔

| ترتیب مصحف موجود | ترتیب مصحف ابی | ترتیب مصحف ابن مسعود |
|---|---|---|
| حمد | حمد | |
| بقرہ | بقرہ | بقرہ |
| آل عمران | نسار | نسار |
| نسار | آل عمران | آل عمران |
| مائدہ | انعام | اعراف |
| انعام | اعراف | انعام |
| اعراف | مائدہ | مائدہ |
| انفال | یونس | یونس |
| برائت | انفال | برائت |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۰ | یونس | برائت | نحل |
| ۱۱ | ھود | ھود | ھود |
| ۱۲ | یوسف | مریم | یوسف |
| ۱۳ | رعد | شعراء | کہف |
| ۱۴ | ابراہیم | حج | بنی اسرائیل |
| ۱۵ | حجر | یوسف | انبیاء |
| ۱۶ | نحل | کہف | طٰہٰ |
| ۱۷ | بنی اسرائیل | نحل | مومنون |
| ۱۸ | کہف | احزاب | شعراء |
| ۱۹ | مریم | بنی اسرائیل | صافات |
| ۲۰ | طٰہٰ | زمر | احزاب |
| ۲۱ | انبیاء | طٰہٰ | حج |
| ۲۲ | حج | انبیاء | قصص |
| ۲۳ | مؤمنون | نور | نمل |
| ۲۴ | نور | مؤمنون | نور |
| ۲۵ | فرقان | سبا | انفال |
| ۲۶ | شعراء | عنکبوت | مریم |
| ۲۷ | نمل | مؤمن | عنکبوت |
| ۲۸ | قصص | رعد | روم |
| ۲۹ | عنکبوت | قصص | یٰسٓ |
| ۳۰ | روم | نمل | فرقان |
| ۳۱ | لقمان | صافات | حجر |
| ۳۲ | سجدہ | صٓ | رعد |



| | | | |
|---|---|---|---|
| ۳۳ | احزاب | یٰسٓ | سبا |
| ۳۴ | سبا | حجر | فاطر |
| ۳۵ | فاطر | شوریٰ | ابراہیم |
| ۳۶ | یٰسٓ | روم | صٓ |
| ۳۷ | صافات | حدید | محمد |
| ۳۸ | صٓ | فتح | لقمان |
| ۳۹ | زمر | محمد | زمر |
| ۴۰ | مومن | تحریم | مومن |
| ۴۱ | حٰم سجدہ | ملک | زخرف |
| ۴۲ | شوریٰ | سجدہ | سجدہ |
| ۴۳ | زخرف | نوح | شوریٰ |
| ۴۴ | دخان | احقاف | احقاف |
| ۴۵ | جاثیہ | قٓ | جاثیہ |
| ۴۶ | احقاف | رحمٰن | دخان |
| ۴۷ | محمد | واقعہ | فتح |
| ۴۸ | فتح | جن | حشر |
| ۴۹ | حجرات | نجم | حٰم سجدہ |
| ۵۰ | قٓ | معارج | طلاق |
| ۵۱ | ذاریات | مزمل | قلم |
| ۵۲ | طور | مدثر | حجرات |
| ۵۳ | نجم | قمر | ملک |
| ۵۴ | قمر | حٰم سجدہ | تغابن |
| ۵۵ | رحمٰن | دخان | منافقون |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ٥٦ | واقعہ | لقمان | جمعہ |
| ٥٧ | حدید | جاثیہ | صف |
| ٥٨ | مجادلہ | طور | جن |
| ٥٩ | حشر | ذاریات | نوح |
| ٦٠ | ممتحنہ | قلم | مجادلہ |
| ٦١ | صف | حاقہ | ممتحنہ |
| ٦٢ | جمعہ | حشر | تحریم |
| ٦٣ | منافقون | ممتحنہ | رحمٰن |
| ٦٤ | تغابن | مرسلات | نجم |
| ٦٥ | طلاق | نبا | طور |
| ٦٦ | تحریم | قیامہ | ذاریات |
| ٦٧ | ملک | تکویر | قمر |
| ٦٨ | قلم | طلاق | واقعہ |
| ٦٩ | حاقہ | نازعات | نازعات |
| ٧٠ | معارج | تغابن عہ | معارج |
| ٧١ | نوح | عبس | مدثر |
| ٧٢ | جن | تطفیف | مزمل |
| ٧٣ | مزمل | انشقاق | تطفیف |
| ٧٤ | مدثر | تین | عبس |
| ٧٥ | قیامہ | علق | دہر |
| ٧٦ | دہر | حجرات | مرسلات |

عہ اتقان کے مطبوعہ نسخہ میں یوں ہی ہے لیکن اس کے محتاج تصحیح ہونے میں شبہ نہیں ۱۲



| | | | |
|---|---|---|---|
| ٧٧ | مرسلات | منافقون | قیامہ |
| ٧٨ | نبا | جمعہ | نبا |
| ٧٩ | نازعات | تحریم | تکویر |
| ٨٠ | عبس | فجر | انفطار |
| ٨١ | تکویر | بلد | غاشیہ |
| ٨٢ | انفطار | لیل | اعلیٰ |
| ٨٣ | تطفیف | انفطار | لیل |
| ٨٤ | انشقاق | شمس | فجر |
| ٨٥ | بروج | طارق | بروج |
| ٨٦ | طارق | اعلیٰ | انشقاق |
| ٨٧ | اعلیٰ | غاشیہ | علق |
| ٨٨ | غاشیہ | صف | بلد |
| ٨٩ | فجر | تغابن | ضحیٰ |
| ٩٠ | بلد | بینہ | طارق |
| ٩١ | شمس | ضحیٰ | عادیات |
| ٩٢ | لیل | انشراح | ماعون |
| ٩٣ | ضحیٰ | قارعہ | قارعہ |
| ٩٤ | انشراح | تکاثر | بینہ |
| ٩٥ | تین | عصر | شمس |
| ٩٦ | علق | خلع | تین |
| ٩٧ | قدر | حفد | ہمزہ |
| ٩٨ | بینہ | ہمزہ | فیل |
| ٩٩ | زلزال | زلزال | قریش |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۰۰ | عادیات | عادیات | تکاثر |
| ۱۰۱ | قارعہ | فیل | قدر |
| ۱۰۲ | تکاثر | قریش | زلزال |
| ۱۰۳ | عصر | ماعون | عصر |
| ۱۰۴ | ہمزہ | کوثر | نصر |
| ۱۰۵ | فیل | قدر | کوثر |
| ۱۰۶ | قریش | کافرون | کافرون |
| ۱۰۷ | ماعون | نصر | تبت |
| ۱۰۸ | کوثر | تبت | اخلاص |
| ۱۰۹ | کافرون | اخلاص | انشراح |
| ۱۱۰ | نصر | فلق | ۔ |
| ۱۱۱ | تبت | ناس | ۔ |
| ۱۱۲ | اخلاص | ۔ | ۔ |
| ۱۱۳ | فلق | ۔ | ۔ |
| ۱۱۴ | ناس | ۔ | ۔ |

(اتقان ج ۱ ص ۶۹)

## مصحف حضرت علیؑ اور ترتیب نزول

مذکورۂ بالا اسلوب کہ جو مختلف صحابہ کی طرف سے جمع قرآن میں اختیار کیے گئے تھے اُس سورت کے یقیناً خلاف ہیں جس پر قرآن مجید نازل کیا گیا تھا۔

اس لیے کہ بتصریح محققین سب سے پہلا سورہ جو جناب رسالتمآبؐ پر نازل ہوا ہے وہ سورۂ اقرار تھا اور اس کے بعد مدثر۔ چنانچہ علامہ سیوطی اتقان میں تحریر کرتے ہیں ۔

اختلف فی اول ما نزل من القرآن علی اقوال احدھا وھو الصحیح انہ اقرأ



باسم ربك " اختلاف ہُوا ہے کہ سب سے پہلے قرآن کا کون جزو نازل ہُوا۔ پہلا قول جو حقیقتاً صحیح ہے وُہ یہی ہے کہ سب سے پہلا نازل ہونے والا ٹکڑا اقرأ باسم ربك ہے اور اسی کی تصدیق میں بخاری نے صحیحین کی حدیث کو نقل کیا ہے۔ (دیکھو اتقان ج ۱ ص ۲۳).

اور واحدی نے اپنی کتاب اسباب النزول (طبع مصر ص ۴) میں اول ما نزل من القرآن کے تحت میں لکھا ہے اقرأ باسم ربك الذی خلق عن عکرمۃ والحسن قالا " اول ما نزل من القرآن بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فھو اول ما نزل من القرآن بمکۃ واول سورۃ اقرأ باسم ربك۔ سورۃ المدثر اول ما نزل بعد سورۃ اقرأ۔

عکرمہ اور حسن کا بیان ہے کہ سب سے پہلے جو آیت قرآن کی مکہ میں نازل ہوئی وہ بسم اللہ ہے اور سب سے پہلا سورہ اقرأ ہے اور اس کے بعد دُوسرا سب سے پہلا سورۂ مدثر ہے۔"

ص ۴ اول سورۃ نزلت علی رسول اللہ بمکۃ اقرأ باسم ربك واخر سورۃ نزلت علی رسول اللہ بمکۃ المؤمنون ویقال العنکبوت واول سورۃ نزلت بالمدینۃ ویل للمطففین واخر سورۃ نزلت فی المدینۃ براءۃ ۔

سب سے پہلا سورہ جو رسالتمآبؐ پر مکہ میں نازل ہُوا " اقرأ " ہے اور آخری سورہ جو مکہ میں اترا مؤمنون اور بقول بعض عنکبوت ہے اور مدینہ میں سب سے پہلا سورہ ویل للمطففین اور آخری سُورہ برأت ہے۔

اب ان روایات کی مطابقت سے جب موجودہ ترتیب قرآن پر نظر کرو تو تمھیں بالکل عکس نظر آئے گا۔

سورۂ برأت جو سب سے آخری سُورہ ہے وُہ قرآن کی پہلی تہائی میں اور اقرأ جو سب سے پہلا سورہ تھا وُہ آخری پارہ میں اور مدنی سورتوں میں کا پہلا سورہ مطففین بھی اسی صورت سے آخر میں ڈال دیا گیا ہے اور اس طرح موجودہ ترتیب کو کوئی مناسبت ترتیب نزول کے ساتھ باقی نہیں رہتی اور معلوم ہوتا ہے کہ ان صحابہ کرام کی نظر میں ترتیب نزول کی مراعات کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

خود حضرت عائشہ اُمّ المومنین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اُس وقت جب

ایک عراقی شخص نے آ کر عرض کیا۔ اے اُمّ المؤمنین مجھ کو اپنا مصحف دکھلایئے؟ فرمایا کیوں
کہا لعلی اؤلف القرآن علیه فانه یقرأ غیر مؤلف "شاید میں اپنے قرآن کو اسی کے
موافق ترتیب دے لوں اس لیے کہ بحالت موجودہ وُہ بلا ترتیب پڑھا جاتا ہے۔

حضرت عائشہ نے کہا وما یضرك ایة قرأت قبل انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فیها ذکر الجنة والنار حتّٰی اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اول شیء لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابداً ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابداً لقد نزل بمكة علی محمد صلی الله علیه وسلم وانی لجاریة العب بل الساعة موعدهم والساعة ادهی وامر وما نزلت سورة البقرة والنساء الا وانا عنده قال فاخرجت له المصحف فاملت علیه السور۔

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے، جو سُورہ بھی پہلے پڑھ لیا جائے۔ سب سے پہلے مفصل سورتوں میں سے ایک سورہ اترا تھا جس میں بہشت و دوزخ کا تذکرہ تھا یہاں تک کہ جب لوگ کثرت سے اسلام کی طرف آ گئے تو حلال و حرام کے احکام نازل ہُوئے اور اگر پہلی ہی مرتبہ لا تشربوا الخمر نازل ہو جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم ہرگز شراب ترک نہ کریں گے اور اگر پہلے ہی یہ حکم آتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔ مکہ میں رسالت مآبؐ پر یہ آیت نازل ہُوئی کہ بل الساعة موعدهم والساعة ادهی وامر اس وقت میں بچہ تھی اور کھیلتی پھرتی تھی اور سورۂ بقرہ و نساء اس وقت نازل ہُوئے کہ جب میرا حضرت کے ساتھ عقد ہو چکا تھا" اس کے بعد اُمّ المؤمنین نے اپنا مصحف نکالا اور اس کے مطابق سُوروں کی فہرست لکھوا دی۔

(صحیح بخاری مطبوعہ کرزن پریس دہلی ص۷۴۶)

اس حدیث سے اچھی طرح قرآن موجود کا ترتیب نزول کے خلاف ہونا ظاہر ہے اس لیے کہ بل الساعة موعدهم الخ سورۂ قمر کی آیت ہے جو بحالتِ موجودہ ستائیسویں پارہ میں ہے اور وُہ حضرت اُمّ المؤمنین کے قول کے مطابق سورۂ بقرہ و نساء سے بہت پہلے نازل ہُوئی تھی

اسی کے ساتھ یہ امر بھی نمایاں ہے کہ موصوفہ کی نظر میں قرآن کی ترتیب کسی خاص تعبدی توقیف پر مبنی نہ تھی اور نہ وُہ کسی خاص ترتیب کا پابند ہے اسی لیے وُہ عراقی کی کاوش کو



بلا ضرورت قرار دیتے ہُوئے ما یضرك ایة قرأت کہہ کر سُورِ قرآن میں ترتیب کی مراعات کو ساقط کیے دے رہی ہیں۔

براء بن عازب کی روایت بھی بخاری میں موجود ہے کہ "تعلمت سبح اسم ربك قبل ان یقدم النبی صلی الله علیه وسلم المدینة" "میں نے سبح اسم ربك کو اس وقت یاد کیا ہے کہ جب رسالت مآبؐ مدینہ میں ہجرت کر کے تشریف بھی نہ لائے تھے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ سورۂ اعلیٰ ہجرت سے قبل نازل ہو چکا تھا حالانکہ وُہ بحالت موجودہ قرآن کے آخری پارہ میں نظر آ رہا ہے۔

**ترتیب آیات** جس طرح سُوروں کی ترتیب اس ترتیب سے مختلف ہے کہ جس پر قرآن نازل ہُوا تھا اُسی طرح آیات کا اگر لحاظ کیا جائے تو اُن میں بھی ترتیبِ نزول کا پتہ نہیں ہے جس کے کئی ثبوت ہیں۔

**(پہلا ثبوت)** مکی سُورتوں کے بیچ میں مدنی آیتیں اور مدنی سورتوں میں مکی آیتیں حالانکہ مکی و مدنی کی اصطلاح جس اصُول پر قائم ہُوئی ہے اس کے مطابق ترتیبِ نزولی کی مراعات کے ساتھ مکی و مدنی آیتوں میں خلط و آمیزش ناممکن ہو جاتی ہے۔

علامہ سیوطی تحریر فرماتے ہیں اعلم ان للناس فی المکی والمدنی اصطلاحات ثلثة اشهرها ان المکی ما نزل قبل الهجرة والمدنی ما نزل بعدها سواء نزل بمكة ام بالمدینة عام الفتح او عام حجة الوداع ام بسفر من الاسفار۔

مکی و مدنی کے متعلق مختلف اصطلاحیں ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ مکی وُہ ہے جو قبل ہجرت نازل ہُوا ہو اور مدنی وُہ کہ جو بعد ہجرت خواہ مکہ میں نازل ہُوا ہو یا مدینہ میں سال فتح مکہ یا حجۃ الوداع یا کسی دُوسرے سفر میں (اتقان ج ۱ ص۶)

اب عقلی حیثیت سے یہ امر تو ممکن ہے کہ کسی سورہ کی ابتدائی آیتیں مکی اور آخری آیتیں مدنی ہوں لیکن اوّل کے مدنی ہونے کے ساتھ آخر کا مکی ہونا یا اوّل و آخر مدنی کے ساتھ وسط مکی یا اوّل و آخر مکی ہونے کے ساتھ وسط کا مدنی ہونا ترتیبِ نزول کے لحاظ سے ممکن نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ جب ہم سُورِ قرآن اور اُن کے آیات پر ائمہ تفسیر و علمائے سیر و تواریخ کے

بیانات کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں تو ان میں ان تینوں طرح کے نمونوں کا ایک عالم نظر آتا ہے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل فہرست سے ہو سکے گا۔

(۱) **انعام** یہ سُورہ مکّی ہے لیکن سات آیتیں مدینہ میں نازل ہُوئی ہیں جو ایک ساتھ مذکور بھی نہیں بلکہ اُن کے درمیان آیاتِ مکیہ مخلوط ہیں۔

الذین اٰتینٰھم الکتٰب یعرفونہٗ کما یعرفون ابناءھم الذین خسروا انفسھم فھم لا یؤمنون اس کے قبل اور بعد آیتیں مکّی ہیں اور یہ خود مدنی ہے پھر وما قدروا اللہ حق قدرہٖ اذ قالوا ما انزل اللہ علیٰ بشر من شیء الخ ابن ابی حاتم کی تصریح کے مطابق یہ آیت مالک بن صیف کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وُہ مدینہ کا واقعہ ہے اس کے بعد ایک آیت مکّی ہے اور پھر ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبا او قال اوحی الیّ ولم یوحَ الیہ شیءٌ الآیۃ اور اس کے بعد والی آیت یہ دونوں مسیلمہ کذاب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جس کے ادعائے نبوّت کا زمانہ رسالتمآبؐ کی زندگی کے آخری دَور میں تھا اور یہ بحالتِ موجودہ مکہ میں نازل ہونے والے سُورۂ انعام کے وسطی حصّہ میں مندرج ہیں۔

پھر اواخر میں قل تعالوا اتل ما حرّم ربکم علیکم سے تین آیتوں تک یہ بھی مدینہ میں نازل ہُوئی تھیں جس کے متعلق حافظ سیوطی کا قول ہے قد صح النقل عن ابن عباس باستثناء قل تعالوا الآیات الثلث۔ لیکن اس کے بعد بارہ آیتیں پھر مکّہ کی نازل شدہ ہیں۔

(۲) **اعراف** مکّی سُورہ ہے مگر واسألھم عن القریۃ التی کانت حاضرۃ البحر۔ دس آیتوں تک مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔

(۳) **انفال** مدنی سُورہ ہے مگر یاایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المؤمنین مکہ میں نازل ہُوا ہے۔

(۴) **ھود** مکّی ہے لیکن تین آیتیں مدنی ہیں فلعلّک تارکٌ۔ افمن کان علیٰ بیّنۃ من ربّہٖ۔ اقم الصلوٰۃ طرفی النھار۔

(۵) **رعد** اس میں یہ آیت ولا یزال الذین کفروا تصیبھم بما صنعوا قارعۃ





یقیناً مکّی ہے اور اللہ یعلم کی آیت شدید المحال تک مدنی ہے اور باقی میں اختلاف ہے کہ وُہ مکّہ میں نازل ہُوا ہے یا مدینہ میں۔

(۶) **ابراھیم** پورا سُورہ مکّی ہے لیکن الم تر الی الذین بدلوا نعمۃ اللہ کفرا سے لے کر فبئس القرار تک دو آیتیں مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔

(۷) **حجر** مکّی سورہ ہے لیکن آیہ ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستاخرین کا بلحاظ اُس کے شانِ نزول کے مدینہ میں نازل ہونا یقینی ہے۔

(۸) **اسراء** مکّی ہے لیکن حسبِ ذیل آیات مدینہ کے نازل شدہ ہیں۔ یسئلونک عن الروح۔ وان کادوا لیفتنونک۔ قل لئن اجتمعت الانس والجن۔ وما جعلنا الرؤیا۔ ان الذین اوتوا العلم من قبلہٖ

(۹) **کھف** ابتدا کی آٹھ آیتیں اور آخر کی چار مدنی ہیں اور درمیان میں مکّی لیکن اس میں بھی واصبر نفسک الخ مدینہ کی نازل شدہ ہے۔

(۱۰) **مریم** مکّی ہے لیکن آیۂ سجدہ اور ان منکم الا واردھا والی آیت اس کے خلاف ہے۔

(۱۱) **طٰہٰ** مکّی سورہ ہے لیکن آیہ فاصبر علیٰ ما یقولون الخ متفقہ طور پر اس سے خارج بھی گئی ہے اور علامہ سیوطی کے خیال میں ایک آیت کو اور مستثنیٰ ہونا چاہیئے اور وُہ یہ ہے۔ لا تمدن عینیک الیٰ ما متعنا بہٖ ازواجا منھم الخ اس لیے کہ یہ اپنے شانِ نزول کی بنا پر مدینہ کی نازل شدہ ہے۔

(۱۲) **انبیاء** مکّی ہے مگر صرف یہ آیت افلا یرون انا نأتی الارض الخ مدینہ میں نازل ہُوئی ہے۔

(۱۳) **حج** مکّی سُورہ ہے جس میں ھٰذان خصمان سے لے کر تین آیتوں تک مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔

(۱۴) **مؤمنون** حتّیٰ اذا اخذنا مترفیھا سے لے کر مبلسون تک جو چودہ آیتیں ہیں وُہ تو مدینہ کی نازل شدہ ہیں باقی سورہ مکّی ہے۔

(١٥) فرقان والذین لایدعون سے رحیما تک جو تین آیتیں ہیں مدنی اور باقی سورہ مکی ہے

(١٦) قصص مکی سورہ ہے جس میں الذین اٰتینٰھم الکتٰب سے لانبتغی الجٰھلین تک جو چار آیتیں ہیں وُہ مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔

اخرج الطبرانی عن ابن عباس انھا نزلت ھی واٰخر الحدید فی اصحاب النجاشی الذین قدموا وشھدوا وقعۃ الاحد

طبرانی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ یہ اور سورہ حدید کا آخر یہ پانچوں آیتیں نجاشی کے ساتھ والوں کے بارے میں نازل ہوئی تھیں جو آکر جنگِ احد میں شریک ہوئے تھے۔ (اتقان ص١٦)

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سورۂ حدید کا آخری حصّہ ان چار آیتوں کے ساتھ نازل ہوا تھا حالانکہ اب ان کے درمیان ربع قرآن سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔

(١٧) عنکبوت شروع کی دس آیتیں مدینہ کی نازل شدہ اور اُس کے بعد سے [...] حصّہ مکی ہے۔

(١٨) لقمان مکی سورہ ہے جس میں لو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام سے تین آیتوں تک مدنی ہیں۔

(١٩) سجدہ اس میں افمن کان مؤمنا سے تین آیتوں تک مدینہ میں نازل ہوئی اور بقیہ حصّہ مکی لیکن اس میں بھی تتجافٰی جنوبھم والی آیت شانِ نزول کی بنا پر مدینہ نازل شدہ ہے۔

(٢٠) یٰسٓ مکی سورہ ہے اس میں انا نحن نحی الموتٰی ونکتب ما قدموا واٰثارھم الخ مدینہ کا نازل شدہ ہے۔

(٢١) زمر قل یا عبادی سے لے کر تین آیتوں تک مدینہ کا نازل شدہ اور [...] حصّہ مکی ہے۔

(٢٢) مومن مکی سورہ ہے جس میں ان الذین یجادلون سے دو آیتیں مدینہ میں [...]



ہوئی ہیں۔

(٢٣) شوریٰ ام یقولون افترٰی علی اللہ کذبا سے چار آیتوں تک مدینہ کی نازل شدہ اور اس کے قبل و بعد کی آیتیں مکی ہیں۔

(٢٤) زخرف مکی سُورہ ہے لیکن واسئل من ارسلنا الخ اس سے خارج ہے۔

(٢٥) جاثیہ مکی ہے اور اس میں قل للذین اٰمنوا والی آیت مدنی ہے۔

(٢٦) احقاف مکی ہے لیکن اس میں قل ارءیتم ان کان من عند اللہ الخ خبرِ صحیح کی بنا پر مدینہ کی نازل شدہ ہے۔

(٢٧) قٓ مکی سُورہ ہے لیکن ولقد خلقنا السمٰوٰت والارض والی آیت مدینہ میں نازل ہُوئی ہے۔

(٢٨) نجم مکی ہے جس میں الذین یجتنبون کبٰئر الاثم والفواحش والی آیت مدینہ کی ہے۔

(٢٩) رحمٰن مکیہ ہے مگر یسئلہ من فی السمٰوٰت والارض الخ کی آیت مدینہ میں نازل شدہ ہے۔

(٣٠) واقعہ مکی ہے لیکن دو مقام اس کے مدنی ہیں۔ ثلۃ من الاولین وثلۃ من الاٰخرین۔ فلا اقسم بمواقع النجوم سے لے کر آٹھ آیتوں تک۔

(٣١) مجادلۃ مکی ہے لیکن ما یکون من نجوٰی ثلٰثۃ الخ مدنی ہے۔

(٣٢) تحریم شروع سے دس آیتیں مدنی اور باقی مکی ہیں۔

(٣٣) نٓ والقلم اس میں انا بلونٰھم سے سترہ آیتوں تک اور پھر فاصبر لحکم [...] سے تین آیتوں تک مدنی ہیں اور باقی ٣٢ آیتیں مکی۔

(٣٤) دھر مکی سُورہ ہے مگر فاصبر لحکم ربک والی آیت مدینہ کی نازل شدہ [...]

(٣٥) مرسلات مکی ہے لیکن اذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون اس سے خارج [...]

اس کے علاوہ بھی مختلف سورتوں میں اختلافی اقوال کی بنا پر خلط و آمیزش موجود ہے جن کو مستند حیثیت سے ثبوت بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے ہم نے ترک کر دیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (اتقان سیوطی ج ۱ ص ۱۵-۱۷)

کیا اس کے بعد یہ امر قابلِ شک و شبہ ہے کہ ترتیبِ آیات میں سلسلۂ تنزیل کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا تھا اور آیات کو بغیر لحاظ تقدیم و تاخیر کے درج کر دیا گیا ہے۔

(دُوسرا ثبوت) قرآن مجید میں عدۂ وفات کے متعلق ارشاد ہُوا ہے۔

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج فان خرجن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن من معروف واللہ عزیز حکیم۔

تم (مسلمانوں) میں سے جن لوگوں کا انتقال ہو جائے اور ان کی بیویاں موجود ہوں تو اُن کی بیویوں کے لیے حکم ہے کہ سال بھر تک نان و نفقہ لے اور وُہ گھروں سے نہ نکلیں پھر جب (سال گذرنے پر) وُہ نکلیں تو جو کچھ وُہ اپنے بارے میں طرزِ عمل اختیار کریں تمہیں کوئی کام اُس سے نہ ہوگا اور خدا غالب و حکیم ہے

اس آیت میں ازواج کے لیے ایک سال تک عدہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن باجماعِ امت یہ حکم اس آیت سے منسوخ ہے کہ

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر وعشرا فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف واللہ بما تعملون خبیر۔

تم (مسلمانوں) میں سے جن لوگوں کا انتقال ہو اور اُن کے بیویاں موجود ہوں تو وُہ چار مہینہ دس دن تک اپنے تئیں روکے رکھیں جب وُہ اس مدت کو پورا کرلیں تو پھر جو کچھ وُہ اپنے بارے میں طرزِ عمل اختیار کریں تمہیں تعرض کا حق نہ ہوگا اور خدا تمہارے اعمال پر مطلع ہے۔

اس آیت میں پہلے حکم کو منسوخ کرتے ہُوئے عدہ کی میعاد چار مہینہ دس دن قرار دی گئی ہے اور یہی حکم وُہ ہے کہ جو مسلمانوں میں معمول بہ ہے۔

نسخ کے لغوی و اصطلاحی دونوں معنی کی بنا پر ناسخ و منسوخ میں ترتب فطری ہے یعنی





یہ کہ منسوخ پہلے اور ناسخ بعد ہو لیکن مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس نظر آتی ہے یعنی قرآن مجید میں دُوسری آیت پہلے اور پہلی آیت بعد ہے۔ دُوسری دُوسرے پارہ کے چودھویں رکوع میں اور پہلی اس کے بعد پندرھویں رکوع میں ہے۔

کیا نظمِ قرآن کے بترتیب نزول ہونے میں یہ صورت ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ یقینی طور پر اس امر کی دلیل ہے کہ جمعِ قرآن کو ترتیبِ نزول سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(تیسرا ثبوت) خود قرآن مجید کے آیات میں عمیق نظر ڈالنے سے یہ بے ترتیبی نمایاں صُورت سے ظاہر ہو جاتی ہے جس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

**پہلی مثال** سورۂ انفال کی ابتدا میں جنگِ بدر کا قصہ حسب ذیل الفاظ میں شروع کیا گیا ہے۔

کما اخرجک ربک من بیتک بالحق وان فریقا من المؤمنین لکارھون یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق بکلماتہ ویقطع دابر الکافرین۔

اسی صُورت پر جس طرح پروردگار نے تمہیں بالکل ٹھیک (مصلحت سے) تمہارے گھر سے (جنگِ بدر میں) نکالا تھا اور مُومنین کا ایک گروہ اس سے ناخوش تھا، وُہ لوگ حق ظاہر ہونے کے بعد بھی تم سے سچی بات میں جھگڑتے تھے گویا وُہ زبردستی موت کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہیں لو دلے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور (یہ وُہ وقت تھا) جب خدا تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ (کفارِ مکہ کی) دو جماعتوں میں سے ایک تمہارے لیے مقرری ہے اور تم یہ چاہتے تھے کہ کمزور جماعت تمہارے ہاتھ لگے اور خدا یہ چاہتا تھا کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ ڈالے۔

اور بالکل اسی سیاق میں مسلمانوں کی پریشانی اور خدا سے فریاد اور ملائکہ کا نصرت پر مامور ہو کے اُترنا ان تمام واقعات کو بیان کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وُہ آیات

جنگِ بدر کے بعد نازل ہُوئے ہیں لیکن اسی کے بعد یہ آیت ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفا فلا تولوھم الادبار ومن یولھم یومئذ دبرہٗ الا متحرفا لقتال او متحیزا الیٰ فئة فقد باء بغضب من اللہ وماوٰہ جھنم وبئس المصیر۔

اے ایمان لانے والو جب کفّار سے جنگ میں مقابلہ ہو تو پشت نہ پھرانا اور جو اس دن اپنی پشت پھرائے گا سوا اس کے کہ جنگ کے واسطے کترائے یا کسی جماعت کے پاس جانے کے لیے ہٹے تو وُہ خدا کے غضب میں گرفتار ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم میں ہے اور وُہ کیا بُرا ٹھکانا ہے۔

یہ تہدیدی آیت یقیناً جنگ کے قبل کی ہے اور اس کو جنگ ختم ہونے کے بعد والے آیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کے بعد پھر ایک مرتبہ سلسلہ قبل والے سیاق سے مل جاتا ہے کہ

فلم تقتلوھم ولٰکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولٰکن اللہ رمٰی۔

تم نے (اے مسلمانو) انھیں قتل نہیں کیا بلکہ ہم نے قتل کیا اور تم نے (اے رسُولؐ) اُن کی طرف سنگریزے نہیں پھینکے بلکہ خدا نے پھینکے ہیں۔

یہ بھی جنگ کے بعد کی آیت ہے جو جنگ کے انجام کو قصہ ماضی کی صُورت میں بیان کر رہی ہے۔ پھر غیر متعلقہ آیات کے بعد جنھیں اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں سورہ کے اواخر میں یہ آیت نظر آتی ہے۔

یا ایھا النبی حرض المؤمنین علی القتال ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین وان یکن منکم مائة یغلبوا الفا من الذین کفروا بانھم قوم لا یفقھون۔

اے پیغمبر تم مومنین کو جنگ پر آمادہ کرو (کہو کہ) اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم ہوں تو انھیں دو سو پر غالب آنا چاہیئے اور اگر سو ہوں تو وُہ ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں اس لیے کہ وُہ لوگ نا سمجھ ہیں۔

قال الحسن ان التغلیظ کان علی اھل بدر ثم جاءت الرخصة

حسن نے کہا ہے کہ "یہ سخت حکم اہلِ بدر کے لیے تھا، پھر اس حکم کو آسان کر دیا گیا"۔





اس بنا پر یہ آیت جنگِ بدر کے پہلے اور دُوسری آیت جس میں اس حکم کو منسوخ کیا گیا ہے وُہ اس آیت کے بعد نازل ہُوئی ہے، ناسخ و منسوخ دونوں آیتوں کا ایک ساتھ ہونا آئینِ نسخ کے خلاف ہے لیکن قرآن مجید میں یہ دونوں آیتیں حالات جنگِ بدر کے بعد پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔

**دُوسری مثال** ۔ سورۂ عنکبوت میں ابراہیم خلیل الرحمٰن کا تذکرہ اس طرح شروع ہُوا ہے۔ وابراھیم اذ قال لقومه اعبدوا اللہ واتقوہ یہاں سے لے کر دو آیتوں تک قصۂ ابراہیم سے متعلق ہیں جن میں ابراہیم کی گفتگو اپنی قوم سے نقل کی گئی ہے کہ ابراہیم نے کہا۔ "خدا کی عبادت کرو اور اُس سے ڈرتے رہو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ تم خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے ہو اور جھوٹی باتیں بناتے ہو۔ یہ کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو تمہاری روزی پر اختیار نہیں رکھتے تو پھر تم خدا ہی سے روزی مانگو اور اسی کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو اور اسی کی طرف تم پلٹ کر جاؤ گے"۔

اس کے بعد دیکھنے والے کی نظر صبر آزما جستجو رکھتی ہوگی کہ اس کا جواب قومِ ابراہیم نے کیا دیا لیکن قرآن مجید میں یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ اس کے بعد چھ آیتیں بالکل غیر متعلقہ ہیں جن کو اس قصہ سے کوئی تعلق نہیں اور اس کے بعد یہ آیت ہے کہ فما کان جواب قومه الا ان قالوا اقتلوہ او حرقوہ الخ کہ جس کو لفظی و معنوی اتصال پہلی دونوں آیتوں کے ساتھ ہے اور اس میں قوم کا جواب ابراہیم کو فائے تفریع کے ساتھ نقل کیا ہے جو اس کے ارتباط کا پہلی آیتوں سے ضامن ہے لیکن افسوس کہ موجودہ صورت جمع و تدوین نے اس اتصال کو افتراق سے بدل کر قرآن کی بلاغت کو دھچکا پہنچا دیا۔

**تیسری مثال** ۔ سورۂ لقمان میں لقمان کے نصائح ذکر کرتے ہُوئے ارشاد ہوتا ہے

واذ قال لقمان لابنه وھو یعظه یا بنیّ لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم

(وُہ وقت یاد کرو) جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہُوئے کہا کہ بیٹا خبردار کسی کو خدا کا شریک نہ بنانا اس لیے کہ شرک یقیناً بڑا سخت گناہ ہے۔

یا بنیّ انھا ان تک مثقال حبة من خردل فتکن فی صخرة او فی السمٰوٰت

بیٹا اس میں شک نہیں کہ عمل اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو اور وُہ کسی سخت پتھر کے اندر یا آسمانوں میں یا

والارض یات بھا اللہ ان اللہ لطیف خبیر۔ | زمینوں میں ہو تب بھی اُس کو حساب کے لیے خدا سامنے لے آئے گا اور خدا بڑا باریک بین واقف کار ہے۔

یہ دونوں آیتیں دست و گریباں ہیں اور جس طرح بعد کی آیتیں وصایائے لقمان میں بالکل سلسلہ وار ہیں اُسی طرح معنوی ارتباط کی بنا پر یہ دونوں آیتیں بھی ایک دُوسرے سے وابستہ ہیں لیکن صورت یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان میں دو آیتیں بالکل غیر متعلق موجود ہیں۔

ووصینا الانسان بوالدیہ حملتہ امہ وھنا علیٰ وھن الخ جو نہ وصایائے لقمانی میں داخل ہیں اور نہ لقمان کا کلام اور نہ قصۂ لقمانی سے کوئی ربط رکھتی ہیں۔

پھر جب اس مقام پر یہ نمونہ واضح طور پر موجود ہے کہ ایسی دو آیتوں کے درمیان میں جو ایک کلام کی جزو اور ایک سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں غیر متعلق آیتوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس نے واقعہ کی بے ساختگی اور کلام کے تسلسل اور بیان کے ارتباط کو غیر معمولی صدمہ پہنچا دیا ہے تو پھر کیوں نہ اسی نوعیت کی

**چوتھی مثال** اس کو سمجھ لیا جائے کہ سورۂ احزاب میں ازواج نبی کی متعلقہ آیتوں میں جن میں صریحی طور سے یا نساء النبی کہہ کر اُن کو مخاطب کیا گیا ہے ایک غیر متعلقہ آیت درج کر دی گئی ہے جو لفظ و معنی دونوں کے اعتبار سے ازواج والی آیتوں سے منافرت رکھتی ہے یعنی انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ خصوصًا جبکہ مستند آثار و احادیث کے رُو سے اُس کا خاص وقت پر مخصوص اشخاص کے متعلق نازل ہونا بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے جس میں ازواج کا کوئی حصّہ نہیں۔

ان تمام اشلہ و نظائر اور اُن کے قبل مذکور ہونے والے ادلہ و شواہد کی بنا پر یہ امر یقینی ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے جمع و تالیف میں باعتبار شانِ نزول کے تقدیم و تاخیر اور تفرق و انتشار پایا جاتا ہے اور وہ اصلی صُورت تنزیل سے کوسوں دُور ہے۔

خوش عقیدہ حضرات اس اندھا دھند کی ذمّہ داری خدا اور رسُولؐ پر عائد کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ قرآن مجید کا نزول غیر مرتب صورت سے تھا اور حسب موقع متفرق طور پر آیات نازل ہوتے تھے۔ بعد میں رسالتمآبؐ جبرئیلؑ امین کی ہدایت سے اُن آیات کو مختلف سوروں





پر تقسیم فرما دیتے تھے کہ یہ آیت اس سُورہ سے متعلق ہے اور یہ آیت اُس دوسرے سُورہ سے۔ اور اس طرح یہ صورت کہ جس پر موجودہ قرآن کی ترتیب ہُوئی ہے لوحِ محفوظ والے مرتب قرآن سے مطابق ہے۔

اور اُس ثبوت میں متعدد روایات کا حوالہ دیا جاتا ہے جن کو علامۂ سیوطی نے اتقان ج ۱ ص ۶۲-۶۳ میں درج کیا ہے۔

(۱) زید بن ثابت کی روایت کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع ہم لوگ جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں قرآن مجید کو مختلف پرزوں سے جمع کیا کرتے تھے۔"

جس کو حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس روایت سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ وُہ جمع و تالیف ترتیبِ نزول کے خلاف تھی۔

(۲) وُہ حدیث جس کو احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان، حاکم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے وُہ کہتے ہیں کہ مَیں نے عثمان سے کہا "یہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا تھا کہ تم نے انفال کو جو مثانی سے ہے اور برات کو جو سور مئین سے ہے قرآن میں ملا کر لکھ دیا اور اُس کے درمیان میں بسم اللہ بھی نہیں لکھی اور پھر ان دونوں کو سبع طوال میں درج کر دیا۔

حضرت عثمان نے جواب دیا کہ "جناب رسالتمآبؐ پر مخصوص تعداد کے سورے نازل ہوا کرتے تھے تو جب کوئی آیت اُترتی تھی آپ اپنے کاتبانِ وحی میں سے کسی کو بلا کر فرماتے تھے کہ ان آیات کو اُس سورہ میں درج کر دو جس میں ایسا ایسا مضمون ہے اور انفال ان ابتدائی سوروں میں سے ہے جو مدینہ میں نازل ہُوئے تھے اور برات سب سے آخر میں اُترا تھا اور اس میں جو واقعہ مذکور ہے وُہ پہلے سورہ کے مضمون سے ملتا جُلتا ہُوا ہے۔ اس بنا پر مجھے گمان ہُوا کہ یہ اُسی پہلے سُورہ کا جزو ہے اس کے بعد جناب رسالتمآبؐ کا انتقال ہو گیا اور حضرت نے ہم کو نہیں بتلایا کہ یہ حقیقۃً اُس سُورہ کا جزو ہے لہذا مَیں نے ان دونوں کو ملا کر لکھ دیا اور بسم اللہ ان دونوں کے درمیان میں درج نہیں کی اور اس کو سبع طوال میں داخل کر دیا۔"

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کسی آیت کے مقام کو تعیین کے

ساتھ نہیں بتلاتے تھے بلکہ یہ فرماتے تھے کہ جس سورہ میں ایسا ایسا مضمون مذکور ہے وہاں درج کردو. یعنی آیات کی ترتیب میں مضمون کی مناسبت کا لحاظ ضروری تھا اب اُن آیات کو کیا کہا جائے جو مضمون کے اعتبار سے بے جوڑ ہونے کے باوجود پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور ایک مسلسل واقعہ کے بیچوں بیچ غیر متعلقہ آیات نظر آتی ہیں کیا اس کی ذمہ داری اُن کاتبان وحی کے سر ہے جن کو رسالتمآبؐ اس امر کا ذمہ دار بنائے ہوئے تھے یا کسی اور پر ؟

(۳) وُہ حدیث جس کو امام احمد نے عثمان بن ابی العاص سے نقل کیا ہے کہ میں حضرت رسُولؐ کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے نظر جما کر دیکھا اور پھر نظر بلند کی اور فرمایا کہ میرے پاس جبریل آئے تھے اور اُنھوں نے ہدایت کی ہے کہ میں اس آیت کو اس سُورہ میں اس جگہ پر رکھ دوں اور وُہ آیت یہ ہے ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ الخ۔

(۴) بخاری نے ابن زبیر کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت عثمان سے کہا والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا والی آیت کو دُوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے پھر آپ اس کو لکھتے اور اُس کو ترک کیوں کرتے ہیں ؟ حضرت عثمان نے کہا یا ابن اخی لا اغیر شیئا منہ من مکانہ فرزند برادر میں اس میں سے کسی چیز کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹاؤں گا۔

اس سے حافظ سیوطی نے یہ مطلب نکالنا چاہا ہے کہ وُہ بالکل حضرت رسُولؐ کی قرارداد کے پابند تھے اور جو آیت جس جگہ رکھ دی گئی تھی اُس سے ہٹانا منظور نہ تھا۔

لیکن درحقیقت یہ مطلب ان الفاظ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا. بات یہ ہے کہ حضرت عثمان نے اختلافات سے عاجز آکر تمام لوگوں کو ایک قرآن کا پابند بنانے کے لیے زید بن ثابت کے جمع کردہ قرآن کے سوا دُوسرے صحابہ کے مصاحف کو نذرِ آتش کرا دیا تھا اور اس قرآن کے سات نسخے لکھوا کر تمام عالمِ اسلام کے اطراف میں روانہ کر دیئے تھے جس کی تفاصیل کے لیے آئندہ کا انتظار کرنا چاہیئے تو ابنِ زبیر کی اس خوردہ گیری پر اُنھوں نے جواب دیا کہ اب میں اس کے ایک حرف کو بھی اس کی جگہ سے نہ ہٹاؤں گا کیونکہ اس سے میری محنت





اکارت ہو جائے گی۔

ان الفاظ کو ترتیب آیات کے توفیقی ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۵) صحیح مسلم کی حدیث حضرت عمر سے کہ میں برابر رسالتمآبؐ سے کلالہ کے معنی پوچھا کرتا تھا آخر حضرت نے (غصّہ سے) اپنی انگلی میرے سینہ میں بھونک کر ارشاد فرمایا

تکفیک ایۃ الصیف التی فی اٰخر سورۃ النّساء

"تمھارے لئے کافی ہے سورۂ نساء کے آخر والی آیت"

(۶) وُہ احادیث جن میں مختلف سُوروں کا نام لے کر اُن کے ابتدا یا انتہا کے آیات کی تلاوت کا ثواب بیان کیا گیا ہے یا مختلف نمازوں میں رسالتمآبؐ کا ان سوروں کو پڑھنا نقل ہُوا ہے۔

لیکن درحقیقت اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید جناب رسالتمآبؐ کے وقت ہی میں اور نزول کے زمانہ ہی سے سوروں کی صورت میں منقسم تھا اور ان سوروں کے اسماء بھی تھے اور اُن کے آیات بھی جداگانہ تھے جس کا ثبوت ان تمام احادیث سے ہوتا ہے کہ جن میں جناب رسالتمآبؐ نے خاص خاص سُوروں کا حوالہ دے کر بعض احکام بیان فرمائے ہیں مگر تنقیح طلب مسئلہ ہے کہ ان سُوروں کی ترتیب کیا موجودہ ترتیب کے مطابق تھی جس میں اوّل کی آیت آخر اور آخر کی آیت اوّل میں ہے یا کچھ اور؟ اس سوال کا جواب مذکورۂ بالا احادیث میں سے کسی سے بھی نہیں نکلتا بلکہ اس کے برخلاف اعلم التابعین سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حبر الامۃ ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یعرف ختم السورۃ حتی ینزل علیہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

"حضرت رسُولؐ کو اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ سورہ ختم ہو گیا جس وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوتی تھی"۔

دُوسری روایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے کنا لا نعلم فصل ما بین السورتین حتی ینزل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"ہم کو دو سوروں کا فاصلہ معلوم نہ ہوتا تھا جب تک کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل نہ ہوتی تھی۔

ان دونوں روایتوں کو مشہور و مسلم الثبوت مفسر امام واحدی نے کتاب اسباب النزول (طبع مصر ص۹) میں درج کیا ہے اور ان دونوں روایتوں سے صاف ظاہر ہے کہ ایک بسم اللہ نازل ہونے کے بعد دوسری بسم اللہ نازل ہونے تک جو کچھ اترتا تھا وہ ایک سورہ سمجھا جاتا تھا اور اس بسم اللہ سے لے کر تیسری بسم اللہ کے اُترنے تک تیسرا سورہ اور علیٰ ہٰذا القیاس۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات کی ترتیب اور سوروں کا انقسام براہ راست سلسلۂ تنزیل کے مطابق تھا اور اُس میں کسی اُلٹ پھیر کو دخل نہ تھا اور موجودہ ترتیب کو کوئی تعلق سُوَر و آیات کی مقرر شدہ ترتیب کے ساتھ نہیں ہے۔

اور پھر جب کہ مستند محدثین کے محررات میں ایسے روایات پائے بھی جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ جمع و تدوین کے سلسلہ میں کسی توقیف و قرار داد کی پابندی اختیار نہ کی گئی تھی چنانچہ حافظ سیوطی نقل کرتے ہیں۔

اخرج ابو داؤد فی المصاحف من طریق محمد بن اسحٰق عن یحییٰ بن عباد عن عبد اللہ بن الزبیر عن ابیہ قال اتی الحارث بن خزیمۃ بہاتین الاٰیتین من اٰخر سورۃ براءۃ فقال اشہد انی سمعتہا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووعیتہا فقال عمر وانا اشہد لقد سمعتہا ثم قال لو کانت ثلث اٰیات لجعلتہا سورۃ علی حدۃ فانظروا اٰخر سورۃ من القراٰن فالحقوہا فی اٰخرہا۔

مشہور حافظ حدیث ابن ابی داؤد نے باسناد خود زبیر بن العوام سے روایت کی ہے کہ حارث بن خزیمہ موجودہ سورۂ برات کی دونوں آخری آیتیں (لقد جاءکم رسول الخ) لے کر آئے اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ مَیں نے رسالتمآبؐ کو اُنھیں پڑھتے ہوئے سُنا ہے اور یاد کیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ مَیں نے ان دونوں آیتوں کو حضرت کی زبان سے سُنا ہے۔ پھر حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر یہ تین آیتیں بھی ہوتیں تو میں اُنھیں مستقل سُورہ قرار



دے دیتا۔ اب ذرا کسی سُورہ کے آخر میں دیکھ کر ان کو اس میں ملحق کر دو۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر اس روایت کی وجہ سے بڑے شش و پنج میں پڑ گئے ہیں اور سیوطی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

یعارضہ ما اخرجہ ابن ابی داؤد ایضاً من طریق ابی العالیۃ عن ابی ابن کعب انہم جمعوا القراٰن فلما انتہوا الی الاٰیۃ التی فی سورۃ براءۃ ثم انصرفوا صرف اللہ قلوبہم بانہم قوم لا یفقہون ظنوا ان ہٰذا اٰخر ما انزل فقال ابی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقرأنی بعد ہٰذا اٰیتین لقد جاءکم رسول الی اٰخر السورۃ۔

"اس حدیث کے معارض ہے وُہ جس کو خود ابن ابی داؤد نے ابو العالیہ کے طریق سے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ صحابۂ کرام نے قرآن جمع کیا تو جب اس آیت تک پہنچے جو سورۂ برارت میں ہے کہ ثم انصرفوا صرف اللہ قلوبہم بانہم قوم لا یفقہون۔ تو خیال ہُوا کہ یہ سب سے آخری آیت ہے جو رسالتمآبؐ پر نازل ہُوئی تھی، ابی نے کہا کہ مجھ کو رسالتمآبؐ نے اس کے بعد دو آیتیں اور یاد کرائی تھیں کہ لقد جاءکم رسول الخ"

لیکن افسوس ہے کہ جب اس حدیث کے متن پر نظر ڈالی جاتی ہے تو وُہ ایسی کمزوریوں پر مشتمل ہے جن کی بنا پر وُہ خود اپنی صحت و اعتبار کو سنبھال نہیں سکتی، دُوسری روایت سے معارضہ کر سکنا کیا معنی رکھتا ہے۔

پہلے تو تمام صحابہ کا یہ خیال کرنا کہ ثم انصرفوا صرف اللہ قلوبہم والی آیت بالکل آخری ہے اور ابی کا صرف اس امر کو ظاہر کرنا کہ اس کے بعد دو آیتیں اور ہیں اس امر کا صاف مظہر ہے کہ ان دونوں آیتوں میں ابی بن کعب متفرد تھے پھر صرف اُن کی گواہی پر یہ دونوں آیتیں قرآن میں درج کیونکر ہو گئیں جبکہ مقررہ اصول کے مطابق جب تک دو گواہ موجود نہ ہوتے کسی آیت کو درج قرآن نہ کیا جاتا تھا یہاں تک کہ اس معاملہ میں حضرت عمر کی شخصیت کا لحاظ نہ کیا گیا اور اُن کی گواہی کو اس بنا پر مسترد کر دیا گیا کہ وُہ اپنی گواہی میں تنہا تھے اور کوئی اُن کے ساتھ نہ تھا۔

اور پھر بقول ان حضرات کے زید بن ثابتؓ صاحب عرضۂ اخیرہ تھے یعنی آخری ترتیب جو جبریل امین کے ساتھ قرآن کا متعابدہ ہُوا تھا اس میں یہ حاضر تھے اور ابی بن کعب بیچارے اس شرف سے محروم بلکہ وُہ قدیم نازل شدہ قرآن کی تعلیم حاصل کیے ہُوئے تھے اور اسی بنا پر جمع قرآن کے لیے ابی کو چھوڑ کر زید بن ثابت کو منتخب کیا گیا تو پھر ایک ایسی آیت جس پر زید مطلع نہ تھے ابی بن کعب کی گواہی پر درج کیونکر کردی گئی، کیا اُس میں یہ شبہ نہ ہو سکتا تھا کہ وُہ منسوخ التلاوۃ ہو اور اسی وجہ سے عرضۂ اخیرہ والے زید بن ثابت کے وُہ گوش گذار نہ ہُوئی۔

اس کے علاوہ اُن لوگوں کو اُس آیت کے متعلق یہ خیال پیدا ہُوا تھا کہ وُہ رسالت مآبؐ پر سب کے بعد نازل ہُوئی ہے لیکن ابی بن کعب نے تبلایا کہ نہیں رسالتمآبؐ نے مجھ کو دو آیتیں اور اس کے بعد یاد کرائی ہیں؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابی بن کعب کے نزدیک قرآن کی اصل ترتیب تاریخ نزول کے مطابق تھی ورنہ اس آیت کے بعد دو آیتوں کا یاد کرانا کبھی اس امر کی دلیل نہ ہوتا کہ ان سے قبل والی آیت سلسلۂ تنزیل کے اعتبار سے بھی آخری نہیں ہے۔

اور پھر جبکہ طریقۂ جمع و تالیف والے احادیث سے درایۃً یہ امر ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ترتیب میں اصلی سلسلۂ ترتیب کا نظم و نسق محفوظ رہا ہو اس لیے کہ زید بن ثابت نے جو جمع قرآن کے ذمہ دار قرار دیئے گئے تھے یہ کہا ہے کہ کنت اجمعه من الرقاع و العسب واللخاف وصدور الرجال میں اس کو کاغذ کے پرزوں، درخت کی چھالوں، پتھر کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرتا تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ آیاتِ قرآن مجتمع و منتظم صورت میں موجود ہی نہ تھے اور نہ اُس طرح کسی سینہ کے اندر محفوظ تھے۔ پھر اگر حقیقۃً اُن آیات کے اندر کوئی ترتیب قائم تھی بھی تو اُس ترتیب کی پابندی اس صورت سے جمع و تالیف میں کیونکر ممکن ہے بلکہ فطرۃً لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آخر کا اوّل اور اوّل کا آخر ہو جائے اور اس طرح موجودہ ترتیب کی ذمہ داری کسی طرح خدا اور رسولؐ پر عائد نہیں ہو سکتی۔

اگر غور کیا جائے تو ترتیب نزول کو سور و آیات قرآن کی افادی حیثیت میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ فلسفۂ تاریخ کی خبر رکھنے والے اس امر کا اندازہ رکھتے ہیں کہ واقعات کے





تسلسل کو اُن کی نوعیت سمجھنے میں کتنا بڑا دخل ہوتا ہے اور واقعات کے اُلٹ پلٹ ہو جانے سے اکثر باتوں کی تہ تک پہنچنے میں کیسی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

درحقیقت بہت سے اختلافات جو آیات قرآن کے معانی میں پائے جاتے ہیں وُہ اسی ترتیب نزول کے برقرار نہ ہونے کا نتیجہ ہیں اسی بناء پر حضرت رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے بڑے راز دار اور مصالح تنزیل کے سب سے زائد باخبر امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اس اہم خدمت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے کر قرآن مجید کو نزول کے مطابق جمع فرمایا جس کو علامہ سیوطی نے اس طرح لکھا ہے کہ فمنهم من رتبها على النزول وهو مصحف على كان اوله اقرأ ثم المدثر ثم ن ثم المزمل ثم تبت ثم التكوير وهكذا الى الأخر المكى والمدنى۔ صحابہ میں سے بعض نے اس کو نزول پر مرتب کیا اور وُہ علیؑ کا مصحف ہے جس کی ابتدا اقرا سے اور اس کے بعد مدثر اور پھر قلم اور پھر مزمل پھر تکویر اور اسی صورت پر آخر تک کی و مدنی سورے ترتیب وار درج ہیں۔ (اتقان ج ۱ ص ۶۳-۶۴)

اور حقیقۃً یہ کام سوائے امیر المؤمنینؑ کے اور کوئی انجام بھی نہ دے سکتا تھا۔ اس لیے کہ عہد رسالت مآبؐ میں قرآن کے آیات جو لکھوائے جاتے تھے وُہ کاغذ کے پُرزوں اور درخت کی چھالوں اور پتھر کے ٹکڑوں پر جن کا مرتب صورت سے کسی مقام پر محفوظ ہونا ناممکن تھا اور صحابۂ کرام جو قرآن مجید یاد کرتے تھے وُہ بھی کسی ترتیب کے ساتھ نہ تھا جس کا اعتراف علامہ شیخ مصطفےٰ صادق رافعی نے اپنی کتاب اعجاز القرآن میں کیا ہے۔ چنانچہ وُہ لکھتے ہیں۔

كان القرآن مرتب الأيات غير انه لم يكن مجموعاً بين دفتين فلا يؤمن ان يضطرب نسق مجموعه فى ايدى الناس باضطراب القطع التى كتب فيها تقديماً و تأخيراً ولم يلزم الناس القرأة يومئذ بتوالى السور وذلك ان الواحد منهم اذا حفظ سورة اركبتها ثم خرج فى سرية فنزلت سورة اخرى فانه كان اذا رجع يأخذ فى حفظ ما ينزل بعد رجوعه وكتابة ويتبع ما فاته على حسب ما تسهل له اكثره او اقله فمن ثم يقع فيما

یکتب تاخیر المقدم و تقدیم المؤخر۔

"قرآن کے آیات بجائے خود ترتیب رکھتے تھے لیکن وُہ کسی ایک شیرازہ میں منسلک تھے لہٰذا یہ اطمینان نہ ہو سکتا تھا کہ اُس کا نظم و نسق لوگوں کے ہاتھ میں اُن ٹکڑوں کے الٹ پلٹ ہو جانے کی وجہ سے جن پر آیات درج تھے بدل نہ جائے گا اور پھر اس زمانہ میں لوگ ترتیب کے ساتھ سُوروں کے حفظ پر بھی مامور نہ تھے بلکہ صورت یہ تھی کہ ایک شخص اُن میں سے جب کوئی سُورہ یاد کرتا تھا یا اس کو اپنے پاس لکھتا تھا اور اس کے بعد اس کو کسی معرکۂ جہاد میں جانے کا اتفاق ہو جاتا تھا تو اس دوران میں بھی کچھ نہ کچھ آیاتِ قرآن اور سُورے نازل ہوتے تھے جب وُہ صحابہ واپس آتے تھے تو اب وُہ اُن آیات کو جو تازہ نازل ہوتی تھیں یاد کرنا اور لکھنا شروع کر دیتے تھے اور باقی ماندہ مقدار کو تھوڑا تھوڑا اپنے پاس لکھتے جاتے تھے اسی وجہ سے ان کے مکتوبہ آیات میں اوّل کا آخر اور آخر کا اوّل ہو جایا کرتا تھا۔

(اعجاز القرآن طبع مصر ص۴۳)

اس طرح ان صحابہ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وُہ قرآن مجید کو سلسلۂ تنزیل کے مطابق یاد کریں اور پھر جب کہ اُن میں سے کوئی بھی آیاتِ قرآن کے نزول کے موقع پر برابر موجود بھی نہ تھا بلکہ اُن میں سے اکثر ہجرت کے بعد اسلام لانے والے تھے جن کی غیبت میں کثیر حصّہ قرآن مجید کا نازل ہو چکا تھا اور انھیں اطلاع بھی نہ تھی کہ کون آیت کب اور کس موقع پر نازل ہُوئی اس کے لیے تو ایک ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو رسالت مآبؐ کے پاس اوائل زمانۂ بعثت سے اس طرح ساتھ رہا ہو جیسے جسم کے لیے سایہ اور سفر و حضر، تنہائی میں اور مجمع میں آپ کا ہم نفس رہا ہو جس کی تعلیم کا بذاتِ خود حضرت کو اتنا خیال ہو جس کی تصویر کشی شاگرد نے ان الفاظ سے کی ہو اذا سألت اجابنی و اذا انطقت ابتدانی جب میں دریافت کرتا تھا تو جواب دیتے تھے اور جب مَیں چُپ رہتا تھا تو خود سے مجھ کو تعلیم فرماتے تھے۔ جس کا دعویٰ یہ ہے واللہ ما نزلت اٰیۃ الا وقد علمت فیما انزلت واین نزلت وعلی من نزلت ان ربی وھب لی قلباً عقولاً ولساناً ناطقاً۔ خدا کی قسم کوئی آیت نازل نہیں ہُوئی مگر یہ کہ مَیں جانتا ہوں وُہ کاہے میں اور کہاں اور کس کے متعلق نازل ہُوئی خدا نے مجھ کو باخبر دل




اور گویا زبان عطا کی ہے۔

یا یہ کہ سلونی عن کتاب اللہ فانہ لیس من اٰیۃ الا وقد عرفت بلیل نزلت ام بنھار ام فی سھل ام فی جبل۔ مجھ سے کتابِ خدا کے متعلق سوال کرو اس لیے کہ کوئی آیت نہیں مگر یہ کہ مَیں جانتا ہوں وُہ شب کو نازل ہُوئی یا دن کو۔ سہل میں یا جبل میں دونوں روایتوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص۱۸۴ بحوالہ طبقات ابن سعد)

اسی بنا پر حضرت کا اس فرض کو ادا کرنا درحقیقت اسلام کی وُہ عظیم خدمت تھی جس کی مسلمان جتنی بھی قدر کرتے کم تھی، اس طرح قرآن خود اپنے مندرجہ حقائق کی ایک مرتب تفسیر ہوتا جس سے نہ معلوم کتنے مشتبہ غوامض حل ہو جاتے۔

اور پھر جب کہ اس فرض کی اہمیت کا اندازہ خود صدر اسلام کے مسلمانوں کو تھا بھی لیکن وُہ صورتِ حال کی بنا پر اس کو غیر ممکن الوقوع سمجھتے تھے جیسا کہ علامہ سیوطی کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن سیرین نے عکرمہ سے پوچھا "الفوہ کما انزل الاول فالاول"۔ "کیا صحابہ نے قرآن کو ترتیبِ نزول کے مطابق سلسلہ وار جمع کیا تھا؟" عکرمہ نے کہا "لو اجتمعت الانس والجن علی ان یؤلفوہ ھذا التالیف ما استطاعوا"۔ "اس صورت میں تو اگر تمام جن و انس بھی جمع ہوتے قرآن مجید کو جمع نہ کر سکتے تھے"۔ (اتقان ص۶۹)

بے شک اس فقرہ کی تعمیمی وسعت میں تنگ نظری و کوتاہ بینی کا عنصر نمایاں ہے۔ گھر کی چار دیواری میں آنکھ کھولنے والا صحرا کی وسعت کا اندازہ نہیں کرتا۔ کال کوٹھری میں پوری زندگی گذار دینے والا اپنی دُنیا اُسی کال کوٹھری میں محدود سمجھتا ہے۔

اور اسی لیے عکرمہ کو نمایاں نمایاں ہستیوں اور ذمہ دار شخصیتوں کے مبلغ علم پر نظر کر کے یہ حکم لگا دینے کا حق ضرور تھا کہ سمندر انہی اٹھتے ہُوئے حبابوں پر منحصر ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ محرابِ عبادت کے تاریک زاویوں میں اور نخلستان یہود کے درختوں کے پاس مشکیزہ بردوش ایسی ہستی بھی ہو سکتی ہے جس کے سامنے یہ مشکل مشکل نہیں ہے۔ وُہ رسُولؐ کا حقیقی وارثِ علم ہے جس نے براہِ راست معدنِ وحی و تنزیل سے اسرارِ تنزیل کو حاصل کر کے گنجینہ کی صورت میں محفوظ کیا ہے اور اس بنا پر اسے حق پہنچتا ہے کہ وُہ اس کے حقیقی صورت پر جمع و تالیف کے

فرض کو انجام دے۔

اب یہ امر "امور مملکت خویش" کے تحت میں شاید زبان کشائی سے بلند و بالا سمجھا جائے کہ بعیر آخر جمع قرآن کے موقع پر امیرالمومنینؑ کے جمع کردہ مصحف کو کم سے کم دیکھنے یا آپ کو جمع قرآن کے کام میں شریک کرنے یا بالا بالا کم از کم آپ سے مشورہ لینے ہی کی ضرورت کیوں نہ سمجھی گئی۔

یہ تاریخ کا حیرت انگیز کرشمہ نہیں تو کیا ہے کہ علامہ مصطفےٰ صادق رافعی "اعجاز القرآن" میں لکھتے ہیں۔

"وما لیس فیه ریب ان منهم قوما جمعوا القرآن کله لذلك العهد وقد اختلفوا فی تعیینهم بید انهم اجمعوا علی نفر منهم علی بن ابی طالب ومعاذ بن جبل وابی بن کعب وزید بن ثابت وعبد الله بن مسعود وهؤلاء کانوا مادة هذا الامر من بعد فان المصاحف التی اختصت بالثقة کانت ثلثة مصحف ابن مسعود ومصحف ابی ومصحف زید۔

"اس میں شبہ نہیں کہ صحابہ میں سے بعض حضرات نے تمام قرآن اسی زمانہ میں جمع کر لیا تھا اور ان لوگوں کی تعیین میں اختلاف ہے لیکن مذکورہ اشخاص کے متعلق اجماع ہے، علیؑ ابن ابی طالب، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود اور یہی لوگ بعد کے لیے اس امر کے سرچشمہ تھے اس لیے کہ جو مصاحف بعد میں مخصوص سمجھے گئے وہ یہ تین تھے۔

۱۔ مصحف ابن مسعود ۲۔ مصحف ابی ۳۔ مصحف زید (ص ۳۵-۳۶)

اوّل و آخر کی تطبیق کے بعد نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ باجماع امت علیؑ ابن ابی طالب نے قرآن جمع کیا تھا لیکن صحابہ کو اعتماد جو پیدا ہوا وہ ابی بن کعب اور عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت کے جمع کردہ قرآن پر اور بس۔

اب امیرالمومنینؑ کے لیے طریق کار دو صورتوں پر منحصر تھا۔ ایک یہ کہ آپ اپنے جمع کردہ مصحف کو منظر عام پر لا کر اس کی نشر و اشاعت میں اپنی پوری کوشش صرف فرماتے اور مسلمانوں کو اس پر عمل کی دعوت دیتے۔ یہ صورت بے شک مسلمانوں کے لیے اُن فوائد سے استفادہ کا





موقع پیدا کرتی کہ جو آیات قرآن کے سلسلۂ نزول کے ساتھ مرتب ہونے میں حاصل ہو سکتے ہیں لیکن اس سے اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کو ایک عظیم صدمہ پہنچتا یعنی اُن کے لیے ایک قرآن کے بجائے دو قرآن ہو جاتے جو اقوام عالم میں اسلام کی عظمت و روحانیت کے لیے سمِ قاتل کا حکم رکھتا تھا اور پھر اُس کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ ابی بن کعب و عبداللہ بن مسعود وغیرہ والے مصحفوں کے ساتھ تیسرے دَور میں وُہ بھی نذرِ آتش نہ کر دیا جاتا۔

دُوسرے یہ کہ آپ باوجود اختلاف مسلک کے مفاد اسلامی کا لحاظ کرتے ہُوئے اپنے مرتب کردہ قرآن کو اپنے پاس محفوظ رکھ کر عملی طور سے اسی صُورت کو تسلیم کر لیں جس کو مسلمانوں کے ذمہ دار افراد نے اپنی صوابدید سے تجویز کر لیا تھا اور اپنے متبعین کو اسی پر عمل کی دعوت دیں اس طرح امیرالمومنینؑ کی ذاتی حیثیت سے اگرچہ ایک حد تک شکست سمجھی جا سکتی ہے یعنی یہ اُن کا مرتب کردہ قرآن مقبولیت عامہ کے درجہ کو حاصل نہ کر سکا بلکہ خود آپ کو دُوسروں کی صوابدید کا پابند ہونا پڑا لیکن اُنھوں نے مفادِ اسلامی کی خاطر کبھی اپنے ذاتی مفاد کا لحاظ نہیں کیا۔ اُنھوں نے اسی اسلامی شیرازہ کی نگہداشت کے لیے اپنے حق کو حاصل کرنے میں زبانی احتجاج پر اکتفا کرتے ہُوئے کبھی عملی اقدام نہیں کیا۔ اُنھوں نے اسی کی خاطر ستائیس برس تک خانہ نشینی گوارا کی اور مقابلہ کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

انجام بین اور عاقبت اندیش حافظ اسلام نے ان دونوں صورتوں کا موازنہ کیا اور پہلی صُورت کو دُوسری صُورت سے زیادہ خطرناک پایا۔ بے شک اگر موجودہ قرآن میں وُہ ایسا تغیر و تبدل پاتے جس سے احکام الٰہیہ اور شریعتِ اسلامیہ پر کوئی اثر پڑتا ہے تو وُہ ضرور اس کے خلاف مظاہرہ کر کے جس صُورت سے بھی ممکن ہوتا حقیقی قرآن کی نشر و اشاعت کرتے لیکن صُورتِ حال اُس کے خلاف تھی۔ اُنھوں نے اپنے مرتب کردہ قرآن کو اپنے پاس محفوظ رکھ کر موجودہ قرآن کو عملی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ اس طرح اگرچہ وُہ فوائد جو ترتیب نزول کی بنا پر حاصل ہو سکتے تھے حاصل نہ ہو سکے لیکن اسلامی عقیدہ قرآن کا شیرازہ درہم و برہم ہونے سے محفوظ رہا اور موجودہ قرآن کو تسلیم کر کے اُنھوں نے اپنے متبعین کو قرآن موجود پر ایمان لانے کا ایک مستند دے دیا جس کی بنا پر وُہ اس کو کلام الٰہی اور کتاب سماوی سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اس جزو کی تفصیل کے لیے ابھی آئندہ

کا انتظار کرنا چاہیئے۔

ہم تو ابھی جمہور مسلمین کے نقطۂ نظر سے یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ عام محدثین نے قرآن مجید کے متعلق کس کس قسم کے روایات درج کیے ہیں اور وہ ایمان بالقرآن کے معیار پر ٹھیک اُترتے ہیں یا نہیں۔

## آیاتِ قرآن میں صحابہ کے اختلافات

قرآن مجید میں صحابہ کا اختلاف صرف سلسلہ و ترتیب میں منحصر نہ تھا بلکہ آیاتِ قرآن میں بھی بہت نمایاں اختلافات پائے جاتے تھے چنانچہ صحیح بخاری میں "مناقب ابن مسعودؓ" کے ذیل میں یہ روایت موجود ہے۔

حدثنا موسٰی عن ابی عوانۃ عن مغیرۃ عن ابراھیم عن علقمۃ قال دخلت الشام فصلیت رکعتین فقلت اللّٰھم یسرلی جلیسا صالحا فرأیت شیخا مقبلا فلما دنا قلت ارجوان یکون استجاب قال من این انت قلت من اھل الکوفۃ قال افلم یکن فیکم صاحب النعلین والوسادۃ والمطھرۃ اولم یکن فیکم الذی اجیر من الشیطان اولم یکن فیکم صاحب السر الذی لا یعلمہ غیرہ کیف قرأ ابن ام عبد واللیل اذا یغشٰی والنھار اذا تجلّٰی والذکر والانثٰی فقال اقرأنیھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاہ الٰی فیّ فما زال ھؤلاء حتی کادوا یردونی۔

علقمہ کا بیان ہے کہ میں شام میں گیا اور دو رکعت نماز پڑھ کر خدا سے دُعا کی کہ خداوندا میرے لیے ایک اچھا ہمنشین پیدا کردے۔ یکایک ایک ضعیف العمر آدمی آتے ہوئے نظر آیا جب میرے قریب آیا تو میں نے کہا کہ انشاء اللہ میری دُعا مستجاب ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ تم کون ہو میں نے کہا کوفہ کا رہنے والا ہوں۔ کوفہ کا نام سُن کر انھوں نے حذیفہ اور عمار کا تذکرہ کیا اور پھر کہا کہ بیچ بتاؤ ابن مسعود واللیل اذا یغشٰی والی آیت کو کیونکر پڑھا کرتے تھے؟ میں نے کہا واللیل اذا یغشٰی والنھار اذا تجلّٰی والذکر والانثٰی ضعیف العمر نے کہا کہ مجھ کو بھی رسالت مآبؐ نے اپنی زبان مبارک سے یونہی یاد کرایا تھا لیکن ان لوگوں نے اس کے خلاف مجھ پر اتنا زور ڈالا کہ قریب تھا میں اس قرات کو ترک کر دوں۔





(بخاری مطبوعہ کرزن پریس دہلی ص۵۳۱)

یہی حدیث اس کے قبل مناقب عمار و حذیفہ کے تحت میں دو طریقوں سے مذکور ہے جن میں تصریح ہے کہ وہ بزرگ جن سے ملاقات ہوئی تھی ابو الدرداء تھے اور دو طریقوں سے باب "من القی لہ وسادۃ" ص۹۲۹ میں مذکور ہے۔ قرآن مجید کی موجودہ آیت میں وما خلق الذکر والانثٰی ہے اور معلوم ہوا کہ ابن مسعود اور ابو الدرداء، دونوں اس کو والذکر والانثٰی پڑھا کرتے تھے علامہ شیخ مصطفٰے صادق رافعی نے بھی جمع قرآن کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ۔

بقیت تلک الصحف عند ابی بکر یتنظر بھا وقتھا ان یحین حتّٰی اذا توفی سنہ ۱۳ھ صارت بعدہ الی عمر فکانت عندہ حتّٰی مات ثم کانت عند حفصۃ ابنتہ صدرا من ولایۃ عثمان ویومئذ اتسعت الفتوح وتفرق المسلمون فی الامصار فاخذ اھل کل مصر عن رجل من بقیۃ القراء فاھل دمشق وحمص اخذوا عن المقداد بن الاسود واھل الکوفۃ عن ابن مسعود واھل البصرۃ عن ابی موسی الاشعری وقرأ کثیر من اھل الشام بقراءۃ ابی بن کعب وکانت وجوہ القراءۃ التی یؤدون بھا القرآن مختلفۃ۔" وہ صحف جو زید بن ثابت نے جمع کیے تھے حضرت ابوبکر کے پاس باقی رہے اور وہ اُن کے متعلق موقع کے منتظر رہے یہاں تک کہ اُن کا انتقال ہو گیا پھر حضرت عمر کے پاس رہے یہاں تک کہ اُن کا انتقال ہوا۔ پھر اُن کی صاحبزادی حفصہ کے پاس حضرت عثمان کی خلافت کے ابتدائی دور میں محفوظ رہے۔ اس زمانہ میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا اور مسلمان اطرافِ عالم میں منتشر ہو گئے تھے لہذا ہر شہر والوں نے حفاظِ قرآن میں سے ایک شخص سے قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ اہلِ دمشق نے مقداد بن الاسود سے اور اہلِ کوفہ نے ابن مسعود سے اور اہلِ بصرہ نے ابو موسٰی اشعری سے اور بہت سے اہلِ شام نے ابی ابن کعب کی قرات سے پڑھنا شروع کیا اور قرات کے اصول جن پر وہ لوگ قرات کرتے تھے مختلف تھے۔ (اعجاز القرآن ص۳۸)

لیکن اس اختلاف کی ذمہ داری بھی رسالت مآبؐ کی طرف عائد ہوئی ان احادیث کی بناء پر جن میں یہ وارد ہوا ہے کہ "انزل القرآن علٰی سبعۃ احرف" قرآن سات حرفوں پر

نازل ہُوا ہے۔"

اگرچہ ان احادیث کے معنی اتنے متشابہ سمجھے گئے کہ اُن میں اختلافات کی حد نہ رہی یہاں تک کہ ابوحاتم محمد بن حبان بستی متوفی ۳۵۴ھ نے ان احادیث کے متعلق علماء کے اقوال کو ۳۵ کی تعداد تک پہنچایا ہے اور اکثر معانی کی بنا پر اُن کو الفاظِ قرآن کے اختلاف سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ہے لیکن موجودہ صحاح سے جس قول کی تائید حاصل ہوتی ہے اور جس پر علمائے اہل سنّت نے صحابۂ کرام کے اختلافات کو منطبق کیا ہے وُہ یہی ہے کہ حروف سے مُراد آیاتِ قرآن میں اپنے اپنے ذوق و زبان کے مطابق الفاظ کا تغیّر و تبدل ہے کہ جس سے مطالب پر کوئی اثر نہ پڑے اس لیے کہ صحابۂ کرام مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور ہر قبیلہ کے لیے اکثر الفاظ کا تلفظ جو دُوسرے قبیلہ میں متداول ہو دشوار تھا اس لیے خداوندِ عالم کی جانب سے رسالتمآبؐ کو قرآن مجید کے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ سات طریقہ پر پڑھنے کی اجازت دی گئی اور حضرت ہر قبیلہ کے شخص کو اسی کے محاورہ کے مطابق قرآن کی تعلیم دیتے تھے چنانچہ نقیب السادۃ الاشراف بالدیار المصریہ سید محمد علی بلاوی اپنی کتاب "التعریف بالنبی والقرآن الشریف" مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۲۹ھ صلک میں احرفِ سبعہ کی تفسیر کرتے ہُوئے لکھتے ہیں۔

المختار ان معنی نزول القرآن علی سبعة احرف اشتماله علی سبعة اوجه یقرأ القاری بأیّ وجه منها علی البدل من صاحبه فایها سمع القاری من النبی صلی الله علیه وسلم قرأبه فقد وسع النبی صلی الله علیه وسلم ان یقرئ کل جماعة بالحرف ای اللغة التی مرنت علیها السنتهم فالهذلی یقرأ عتی حین بدل حتی حین والاسدی تعلمون بکسر التاء بدل تعلمون بفتح التاء ولو اراد کل فریق ان یزول عن لغته وما جری علیه لسانه طفلا و ناشئا و کهلا لشق ذلک غایة المشقة فابیح النبی صلی الله علیه وسلم ان یقرأهم بلغاتهم تیسیرا من الله علی خلقه و تحقیقاً لما اتصف به صلی الله علیه وسلم من الرافة بامته والشفقة علیهم۔

"قول مختار یہ ہے کہ معنی سات حرفوں پر نزولِ قرآن کے یہ ہیں کہ اس میں سات صُورتیں





پائی جاتی ہیں جن کے ساتھ ادل بدل کر اُس کو پڑھا جاسکتا ہے تو اُن صُورتوں میں سے جس طرح بھی رسالتمآبؐ کی زبان سے گوش گذار ہو جائے اس صُورت سے پڑھنا جائز ہوگا کیونکہ رسالتمآبؐ کو اجازت دی گئی تھی کہ وُہ ہر جماعت کو اُسی کی مادری زبان اور فطری محاورہ کے مطابق قرآن کی تعلیم دیں تو قبیلۂ بنی ہذیل کا شخص مثلاً حتی حین کو عتی حین پڑھ سکتا تھا اور بنی اسد کا آدمی تعلمون بفتح تار کو تِعلمون بکسر تار پڑھنے کا حق رکھتا تھا اور اگر ہر قبیلہ یہ چاہتا کہ اپنے روزمرّہ محاورہ کو ترک کردے جس کا وُہ بچپنے جوانی اور ادھیڑ عمر میں عادی ہوچکا ہے تو اُس میں اُن کے لیے بہت بڑی دشواری پیش آتی اس لیے رسالتمآبؐ کے لیے جائز قرار دیا گیا کہ وُہ اُن کو انہی کی زبان میں قرآن کی تعلیم دیں۔ اس طرح خداوندِ عالم کی طرف سے اپنے مخلوق کے لیے سہولت پیدا کی گئی اور حضرت رسُولؐ کی مہربانی و شفقت اپنی اُمّت پر پایۂ ثبوت کو پہنچی۔"

یہ اختلاف صرف طریقۂ تلفظ یا صرف حرکاتِ حروف میں محدود نہ تھا بلکہ یہ اختلاف اس حد پر تھا کہ جس سے صحابۂ کرام کو بعض اوقات تشویش اور اضطراب پیدا ہوجاتا تھا اور آخر جب جناب رسالتمآبؐ کی طرف رجوع کرتے تھے تو حضرت فرماتے تھے کہ دونوں ٹھیک ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر فرماتے ہیں۔

سمعت هشام بن حکیم یقرأ سورة الفرقان فی حیوة رسول الله صلی الله علیه وسلم فاستمعت لقرأته فاذا هو یقرأ علی حروف کثیرة لم یقرأنیها رسول الله صلی الله علیه وسلم فکدت اساوره فی الصلوٰة فصبرت حتی سلم فلببته بردائه فقلت من اقرأک هذه السورة التی سمعتک تقرأ قال اقرانیها رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت کذبت فان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد اقرأنیها علی غیر ما قرأت فانطلقت به اقوده الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت انی سمعت هذا یقرأ بسورة الفرقان علی حروف لم تقرانیها فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ارسله اقرأ یا هشام فقرأ علیه القراءة التی سمعته یقرأ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم کذلک انزلت ثم قال

اقرا یا عمر فقرأت القرأة التی اقرانی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذالک انزلت ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ احرف فاقرأوا ما تیسر منہ۔

میں نے ہشام بن حکیم کو جناب رسالتمآبؐ کی زندگی میں سورۂ فرقان پڑھتے دیکھا، میں نے غور سے سننا شروع کر دیا تو معلوم ہُوا کہ وُہ بہت سے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جن کے ساتھ مجھ کو رسالت مآبؐ نے اس سورہ کی تعلیم نہیں دی تھی۔ بس قریب تھا کہ نماز ہی میں اُن سے دھر پیچ کروں مگر نفس پر جبر کر کے مَیں نے صبر کیا یہاں تک کہ اُنھوں نے سلام پھیرا۔ اس وقت مَیں نے بڑھ کے اُن کی چادر کا پھندا بنا کر اُن کے گلے میں ڈالا اور ان کو کھینچ کر کہا کہ تم کو یہ سُورہ جو مَیں نے تمھیں پڑھتے سُنا کس نے یاد کرایا ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ مجھ کو جناب رسالتمآبؐ نے اس کی تعلیم دی ہے۔ مَیں نے کہا تم بالکل غلط کہتے ہو، رسالت مآبؐ نے خود مجھ کو اس سورہ کی تعلیم دی ہے اُس صُورت سے جداگانہ کہ جس طرح تم نے پڑھا، یہ کہہ کر میں انھیں کھینچتا ہُوا رسالتمآبؐ کے پاس لایا اور کہا کہ دیکھئے تو یہ سورۂ فرقان کو ایسے الفاظ کے ساتھ پڑھتا ہے جن کے خلاف آپ نے مجھ کو تعلیم دی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ "اسے چھوڑ دو تو" پھر ہشام کی طرف مخاطب ہو کر کہا پڑھو تو! کیونکر پڑھتے ہو؟ ہشام نے سورہ کو اُسی طرح سے پڑھا جس طرح مَیں نے اُن سے سُنا تھا حضرت نے فرمایا۔ بے شک یہ سُورہ اس طرح نازل ہُوا ہے پھر مجھ سے فرمایا اچھا تم پڑھو۔ مَیں نے بھی اُسی صورت سے جس طرح مجھ کو یاد تھا پڑھا حضرت نے فرمایا ہاں اس طرح بھی نازل ہُوا ہے پھر فرمایا کہ یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہُوا ہے اور تم لوگوں کو اختیار ہے کہ اُن میں سے جو آسان ہو اُس طرح اُس کو پڑھو"۔

(بخاری مطبوعہ کرزن پریس دہلی صفحہ ۷۴۵)

اسی بنا پر حضرات شیخین نے ان اختلافات کو گوارا کیا اور اگرچہ خود قرآن مجید کو زید بن ثابت کے توسط سے جمع کرا لیا تھا لیکن دُوسرے صحابہ کو مجبور نہیں کیا کہ وُہ بھی اُسی صورت پر قرآن مجید کو پڑھیں اور تعلیم دیں بلکہ حضرت عمر نے ابی بن کعب کو جن کے مصحف کی ترتیب بالکل مصحف زید سے جداگانہ اور جن کی قرأت بھی اُن کی قرأت سے مختلف تھی۔ خود نماز تراویح کا امام مقرر کیا اور تمام لوگوں کو مامور کیا کہ وُہ انہی کی قرأت کے ساتھ پڑھیں اور جب





کسی قرأت کے متعلق اُن کو علم ہو گیا کہ یہ ابی بن کعب کی بتلائی ہُوئی ہے تو پھر وُہ سوائے تسلیم کر لینے کے اُس کے متعلق ایک حرف بھی نہ کہتے تھے۔ چنانچہ ملا علی متقی نے کنز العمال میں نقل کیا ہے۔

عن بجالۃ قال مر عمر بن الخطاب بغلام وھو یقرأ فی المصحف النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم وھو اب لھم فقال یا غلام حکھا قال ھذا مصحف ابی فذھب الیہ فسألہ فقال انہ کان یلھینی القرآن ویلھیک الصفق بالاسواق۔

حضرت عمر نے ایک لڑکے کو مصحف میں پڑھتے سُنا کہ النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم وھو اب لھم حضرت نے فرمایا کہ اس (وھو اب لھم کے فقرہ) کو چھیل ڈالو اُس نے کہا کہ یہ کسی اور کا نہیں ابی بن کعب کا مصحف ہے۔ یہ سُن کر آپ ابی کے پاس گئے اور اُن سے دریافت کیا۔ ابی نے کہا کہ آپ کو کیا خبر، میرا دن رات قرآن میں صرف ہوتا تھا اور آپ کو بازاروں میں پھرنے سے فرصت نہ تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابی کے مصحف میں آیہ النبی اولی بالمؤمنین کے آخر میں وھو اب لھم کا ٹکڑا زیادہ تھا جو زید بن ثابت کے جمع کردہ قرآن میں موجود نہیں ہے لیکن حضرت عمر نے اُس کو برداشت کر لیا۔

اور عبداللہ بن مسعود کے متعلق اتنا اعتماد تھا کہ جب عمر کے پاس ایک شخص نے مقام عرفات میں آ کر کہا کہ جئتک من الکوفۃ وترکت بھا رجلا یحکی المصحف عن ظھر قلبہ میں کوفہ سے آیا ہوں اور وہاں ایک شخص کو چھوڑا ہے کہ وہ مصحف کو بالکل ازبر پڑھتا ہے تو یہ سُن کر آپ کو بڑا شدید غصہ آیا اور کہا ویحک ومن ھو جلدی بتا وُہ ہے کون؟ اُس نے کہا عبداللہ بن مسعود۔ فوراً آپ کا غصہ فرو ہو گیا اور کہا واللہ ما اعلم احدا احق بذالک منہ خدا کی قسم میں کسی شخص کو نہیں دیکھتا کہ وُہ اُن سے زیادہ اس امر کا حقدار ہو۔

(ملاحظہ ہو استیعاب ابن عبدالبر برحاشیۂ اصابہ طبع مصر ج ۲ صفحہ ۳۲۲)

اور اس روایت کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اصابہ (ج ۲ صفحہ ۳۶۹) میں درج کیا

ہے یہ صورتِ حال اسی طرح قائم رہی اور صحابہ پوری آزادی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت اپنے اپنے طریقہ پر کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت عثمان کا دَور آیا اور اس وقت یہ اختلاف نظامِ اسلامی کے لیے مضر قرار دیا گیا اور اطراف سے فریادیں آنے لگیں کہ صحابہ کرام کے اختلاف کی وجہ سے قریب ہے کہ لوگ ایک دُوسرے کی تکفیر کرنے لگیں اور خود قرآن مجید کی آیات کا انکار کر دیں اور اس کی وجہ سے آتشِ فتنہ و فساد رونما ہو چنانچہ اس صُورتِ حال اور اس کے نتائج کی مرقع کشی علامہ رافعی نے حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔

كانت وجوه القراءة التي يؤدون بها القرآن مختلفة باختلاف الأحرف التي نزل عليها كما سيمر بك فكان الذي يسمع هذا الاختلاف من اهل تلك الامصار اذا احتوتهم المجامع او التقوا في المواطن على جهاد اعدائهم يعجب من ذلك ان تكون هذه الوجوه كلها على اختلاف ما بينها في كلام واحد فاذا علموا ان جميع القراءات مسندة الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وانه اجازها لا يمنع ان يحيك في صدره بعض الشك وان ينطوي منها على شيء اذ هو قد كان نشأ بعد زمن الدعوة وبعد ان اجتمع العرب على كلمة واحدة فلا يلبث ان يجري ذلك الاختلاف مجرى مثله من سائر الكلام فيرى بعضه خيرا من بعضه ويظن منه الصريح والمدخول والعالي والنازل والافصح والفصيح واشباه ذلك ويعتد ما يراه في القرآن من القرآن وهذا امر ان هو استفاض فيهم ثم مردوا عليه خرجوا منه ولا ريب الى المناقضة والملاحاة والى ان يرد بعضهم على بعض هذا يقول قراءتي وما اخذت به وذلك يقول بل قراءتي وما انا عليه وليس من وراء هذا اللجاج الا التكفير والتأثيم ولا جرم انها الفتنة لا تفنا بعد ذلك من دم۔

قرارت کے اصُول جن پر وُہ لوگ قرآن پڑھا کرتے تھے مختلف تھے اُن حروف کے اختلاف کی بناء پر کہ جن پر قرآن نازل ہُوا تھا تو جب یہ مختلف صورتوں پر قرآن کو جاننے والے کسی مجلس میں جمع ہوتے یا میدانِ جنگ میں یکجا ہوتے تھے اور دیکھنے والا اُن کے اختلافات





کو قرآن مجید کے آیات میں دیکھتا تھا تو اسے تعجب ہوتا تھا کہ یہ سب الفاظ باوجود اپنے اختلاف کے ایک ہی کلام میں کیونکر صحیح ہو سکتے ہیں، اُس کے ساتھ جب اُسے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب قرائتیں رسالت مآبؐ کی طرف استناد رکھتی ہیں حضرتؐ نے ان کے متعلق اجازت دی ہے تو یقیناً موقع تھا کہ اُس کے سینہ میں شک و شبہ کسی حد تک خراش پیدا کرے اور کچھ نہ کچھ دل میں آئے اس لیے کہ اس شخص کی نشوونما ایسے وقت پر ہُوئی تھی کہ جب ابتدائے دعوتِ اسلام کو طویل زمانہ گزر چکا ہے اور تمام قبائل عرب ایک کلمہ پر جمع ہو چکے ہیں۔ اس کا قریبی نتیجہ یہ تھا کہ وُہ اس اختلاف کو قرآن کے علاوہ دُوسری کتابوں کے اختلاف نسخ کی صُورت سے قرار دے کر قرآن میں محاکمہ پر تیار ہو جاتا کہ یہ اُس سے بہتر ہے اور یہ صریح ہے وُہ مدخول، یہ عال ہے اور وُہ پست، یہ افصح ہے اور وُہ فصیح اور اس طرح اپنے ذاتی خیالات کو قرآن میں داخل کر دیتا۔

یہ ایسا امر تھا کہ اگر اس کی زیادتی ہوتی اور لوگوں کو اس کا چسکا لگتا تو یقیناً نتیجہ میں باہمی مناقشہ ومنازعہ اور نقض ورد تک نوبت پہنچتی، یہ کہتا کہ میری قرارت اور میرا انتخاب بہتر ہے، وُہ کہتا کہ نہیں بلکہ میری قرارت اور میرا مسلک بہتر ہے اور اس اختلاف کے آخر میں سوائے اس کے کہ ایک دُوسرے پر کفر کا حکم لگائے اور گنہگار بتلائے کوئی اثر مترتب نہ ہوتا اور یقیناً یہ ایک ایسا فتنہ تھا جس کی انتہا آخر میں خونریزی تک ہونا ناگزیر تھی۔"

حضرت عثمان کو اس امر کی طرف خاص طور سے توجہ ہُوئی خصوصاً اُس وقت کہ جب حذیفہ بن الیمان آرمینیہ و آذربائیجان کی فتح کے سلسلہ میں جنگ پر گئے اور وہاں سے واپس آکر اُنھوں نے بڑی اہمیت کے ساتھ لوگوں کے اختلافات کا تذکرہ کیا اور کہا کہ جلد خبر لیجیے نہیں تو اُمتِ اسلامیہ یہود و نصاریٰ کی طرح کتابِ خدا میں مختلف ہو جائے گی۔ حضرت عثمان کو اس کے سوا کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ حضرت رسُولؐ کی اجازت کو منسوخ کرتے ہوئے تمام لوگوں کو ایک ہی قرأت کا پابند بنا دیں اور چھ قرائتوں کو جن کے ساتھ پڑھنے کی اب تک اجازت تھی جُرم قرار دے دیں چنانچہ اس غرض کے لیے اُنھوں نے اُس قرآن کو جو حضرت ابوبکر کے زمانہ میں زید بن ثابت کے ہاتھوں جمع ہو چکا تھا حفصہ بنت عمر کے پاس سے منگوا بھیجا اور طے پایا کہ اُسی کے موافق نسخے لکھوا کر تمام ممالک میں منتشر کیے جائیں اور اُس کے سوا جتنے نسخے قرآن کے مجتمع یا غیر مجتمع

صورت میں مختلف صحابہ کے پاس پائے جاتے ہیں اُن کو نذرِ آتش کر دیا جائے اور اس امر کی احتیاط کے لیے کہ ان نقل شدہ نسخ کو کوئی اختلاف پہلے نسخوں کے ساتھ نہ ہو اور یہ کہ خود اُس نسخہ پر نظرِ ثانی بھی ہو جائے پھر زید بن ثابت کو منتخب کیا گیا اور اُن کے ساتھ عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص وعبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام مخزومی کو معاون کے طور پر اُن کا شریک بنایا گیا۔

اس واقعہ کا تذکرہ صحیح بخاری میں حسب ذیل الفاظ میں موجود ہے۔

حدثنا موسٰی قال حدثنا ابراهیم قال حدثنا ابن شهاب ان انس بن مالك حدثهٗ عن حذیفة بن الیمان قدم علی عثمان وکان یغازی اهل الشام فی فتح ارمینیة وآذربیجان مع اهل العراق فافزع حذیفة اختلافهم فی القراءة فقال حذیفة لعثمان یا امیر المؤمنین ادرك هٰذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیهود والنصاری فارسل عثمان الی حفصة ان ارسلی الینا بالصحف ننسخها فی المصاحف ثم نردها الیك فارسلت بها حفصة الی عثمان فامر زید بن ثابت وعبد الله بن زبیر وسعید بن العاص وعبد الرحمٰن بن الحارث بن هشام فنسخوها فی المصاحف وقال عثمان للرهط القرشیین الثلثة اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شیٔ من القرآن فاکتبوه بلسان قریش فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتی اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد عثمان الصحف الی حفصة وارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواه من القرآن فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق۔

انس بن مالک کا بیان ہے کہ حذیفہ بن یمان حضرت عثمان کے پاس آئے اور اس سے قبل وُہ آرمینیہ وآذربائیجان کی فتح کے سلسلہ میں اہلِ شام وعراق کے ساتھ جنگ میں شریک تھے اور اس دوران میں جو اختلافات اُنھوں نے قرأتِ قرآن میں دیکھے اُن سے پریشان ہو گئے تھے اس لیے اُنھوں نے حضرت عثمان سے کہا کہ اے فرمانروائے مسلمین اس اُمّت کی خبر لیجئے قبل اس کے کہ اُن میں کتابِ خدا کے بارے میں ویسا اختلاف پڑے جیسا کہ یہود و نصاریٰ کے اندر ہے۔ یہ سُن کر حضرت عثمان نے حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کہ وُہ قرآن کے اجزاء جو تمھارے پاس ہیں





بھیج دو ہم اس کو مجموعی حیثیت سے مصحف کی صُورت میں نقل کرا کے واپس کر دیں گے۔ حفصہ نے اُن اجزاء کو عثمان کے پاس بھیج دیا۔ اُنھوں نے زید بن ثابت اور عبداللہ بن زبیر اور سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حکم دیا اور اُنھوں نے اُس کو مصاحف کی صورت میں نقل کیا اور عثمان نے ان تینوں قریشی آدمیوں کو حکم دیا تھا کہ جب تم میں اور زید بن ثابت میں کسی لفظ کے متعلق اختلاف ہو تو اُس کو قریش کے محاورہ پر لکھنا کیونکہ قرآن کا اصلی نزول قریش کی زبان میں ہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا یہاں تک کہ جب اُن اجزاء کی نقل مصحف کی صُورت میں ہو گئی تو وُہ اجزاء حفصہ کے پاس واپس کیے گئے اور اطراف وجوانب میں سے ہر مُلک میں ایک نسخہ اس کا بھیج دیا گیا اور جتنے قرآن کے نسخے اس کے علاوہ متفرق اجزاء یا مجمع کتاب کی صورت میں تھے اُن کے متعلق حکم ہُوا کہ وُہ آگ میں جلا دیئے جائیں۔

(بخاری کرزن پریس دہلی ص۷۴۶)

حدیث مذکور سے صاف ظاہر ہے کہ جمع قرآن کے سلسلہ میں حضرت عثمان نے خود کاوش و کاہش کی ضرورت نہیں سمجھی تھی بلکہ اُنھوں نے اسی جمع و تالیف پر اعتماد کیا جو حضرت ابوبکر کے حکم سے عمل میں آ چکی تھی، بے شک اس میں اطمینان حاصل کرنے کے لیے کہ موجودہ نسخے اس کے مطابق رہیں۔ تصحیح و تنقیح کا کام اُنھی زید بن ثابت کے سپُرد کیا گیا جو پہلی تالیف کے ذمّہ دار تھے اور چونکہ منظور یہ تھا کہ قرآن کی جو مختلف قراتیں ہو گئی ہیں اُن کا قلع قمع ہو کر ایک قرأت پر اتفاق حاصل ہو اس لیے اُن الفاظ کی تعیین کے لیے جن کا طریقہ اداء اور رسم الخط مختلف ہے اور اس اعتبار سے اُن میں اختلاف کی گنجائش ہے تین قریشی آدمیوں کو اُن کا شریک کار قرار دیا گیا تھا لیکن یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اُس اہتمام و انتظام کے جو سابقہ مرتب جمع قرآن میں ہو چکا تھا۔ اب کی جو نقل کے سلسلہ میں زید بن ثابت نے مراجعہ کیا تو خود اُن کو اُس قرآن میں بعض آیات کی فروگذاشت نظر آئی جنھیں پھر تحقیق کے بعد اضافہ کی ضرورت محسوس ہُوئی۔ چنانچہ بخاری میں حدیث مذکور بالا کے بعد ہی لکھا ہے۔

قال ابن شهاب واخبرنی خارجة بن زید بن ثابت سمع زید بن ثابت قال فقدت اٰیة من الاحزاب حین نسخنا المصحف قد کنت اسمع رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأبھا فالتمسناھا فوجدناھا مع خزیمۃ بن ثابت الانصاری من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فالحقناھا فی سورتھا فی المصحف۔

" ابن شہاب نے زید بن ثابت کے صاحبزادے سے خود زید بن ثابت کا بیان نقل کیا ہے کہ وُہ کہتے تھے جب میں مصحف کے لکھنے میں مصروف تھا تو ایک آیت سورۂ احزاب میں کی جس کو میں رسالت مآبؐ کو پڑھتے ہوئے سُنا کرتا تھا نہ ملی۔ ہم نے اس کو ڈھونڈھنا شروع کیا تو وُہ خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس دستیاب ہُوئی من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ چنانچہ ہم نے اس کو اُس کے سُورہ کے آخر میں مصحف کے اندر درج کر دیا۔"

درحقیقت زید بن ثابت کو آیت پوری یاد نہ تھی ورنہ اُنھیں اس کے ڈھونڈھنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ کچھ کچھ اُس کی لفظیں یاد آتی تھیں کہ حضرت ایک اس قسم کی آیت سورۂ احزاب میں پڑھا کرتے تھے اور وُہ اب دستیاب نہیں ہوتی اسی بنا پر اُنھوں نے اُس کو تلاش کرنا شروع کیا جس میں وُہ خزیمہ بن ثابت کے پاس کامیاب ہُوئے۔

اس سے یہ خیال باور ہُوا ثابت ہوجاتا ہے کہ زید بن ثابت رسالتمآبؐ کی زندگی میں حفظ قرآن کرچکے تھے اور اُس کی دلیل یہی احادیث ہیں جن میں اُن کا پتہ دے دے کر آیاتِ قرآن کی جستجو کرنا مذکور ہے لیکن ہمارے بیان سے ثابت ہوگیا کہ اس خیال میں کوئی وزن نہیں ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ پہلی مرتبہ جمع قرآن بالکل بے توجہی وکم التفاتی کے ساتھ ہُوا تھا اور مقابلہ وتکرار نظر کی نوبت نہ آئی تھی، یقیناً کتنی مرتبہ مقابلہ اور کس کس طرح تکرار نظر کی گئی ہوگی جب یہ اعتماد حاصل ہُوا کہ قرآن مجید جمع ہوگیا۔ لیکن پندرہ برس کے بعد جب حضرت عثمان کے دَور میں نظر کی نوبت آئی تو ایک آیت کم معلوم ہُوئی پھر اس مرتبہ کے جمع وتالیف میں کیا ضمانت ہوسکتی ہے کہ کسی قسم کی کوئی آیت نہیں رہ گئی۔

پھر الفاظ قرآن میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خامیاں رہ گئی تھیں جن کی اصلاح اس مرتبہ کی گئی جیسا کہ ابن فارس نے ہانی سے نقل کیا ہے کنت عند عثمان رضی اللہ تعالیٰ




عنہ وھم یعرضون المصاحف فارسلنی بکتف شاۃ الی ابی بن کعب فیھا "لم یتسن" و "فامھل الکافرین" و "لا تبدیل للخلق" قال فدعا بالدواۃ فمحا احدی اللامین وکتب "لخلق اللہ" ومحا فامھل وکتب "فمھل" وکتب "لم یتسنہ" الحق فیھا ھاء او القراءۃ علی ھذا الرسم۔

مَیں حضرت عثمان کے پاس تھا جس وقت مصاحف کا مقابلہ ہو رہا تھا، اُنھوں نے مجھ کو ایک بکری کا شانہ دے کر ابی بن کعب کے پاس بھیجا جس پر لکھا تھا لم یتسن اور فامھل الکافرین اور لاتبدیل للخلق ابی بن کعب نے دوات منگوائی اور للخلق کی لفظ میں ایک لام چھیل کر لخلق اللہ بنا دیا اور فامھل کو چھیل کر فمھل بنا دیا اور لم یتسن میں ہا ملا کر لم یتسنہ کر دیا اور اب اسی صُورت پر پڑھا جاتا ہے۔"

(اعجاز القرآن رافعی ص۴۶)

اب اس کو جانے دو کہ زید بن ثابت صاحب عرضۂ اخیرہ سے آخر ان الفاظ میں غلطی کیوں ہوئی تھی اور پھر کیا یہ شبہ پیدا نہیں ہوتا کہ کسی اور لفظ میں بھی ایسی غلطی ہو۔ لیکن اتنا سوال غالباً حق بجانب سمجھا جائے گا کہ مذکورہ صُورتِ حال میں لاتبدیل لخلق اللہ اور اس کے ساتھ والی دونوں لفظیں کیا صرف ابی بن کعب کی تجویز کا نتیجہ نہیں ہیں اور پھر کیا اُن کا تواتر باقی رہا ہے؟

یہ سوال گذشتہ جمع قرآن اور موجودہ تصحیح وتنقیح دونوں موقعوں کے متعلق بہت اہم ہے کہ آخر زید بن ثابت کو بڑے بڑے صحابہ کی موجودگی میں جمع قرآن کے لیے منتخب کرنے کی کیا وجہ تھی؟ اور اُن میں کون سا امتیاز تھا کہ ابی بن کعب وعبداللہ بن مسعود ایسی ہستیوں کے مقابلہ میں اُن کے جمع کردہ قرآن کا اعتبار کیا جائے؟

اس کے متعلق علمائے اہلِ سنّت نے بڑی کاوش کے ساتھ یہ وجہ نکالی کہ حضرت جبرئیلؑ جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ ہر سال قرآن کا مقابلہ کیا کرتے تھے اور اس میں ہر مرتبہ کچھ آیات منسوخ اور کچھ متغیر اور کچھ اپنی جگہ سے دوسری جگہ اول بدل کر دیئے جاتے تھے اور آخری مرتبہ اس سال کہ جب جناب رسالت مآبؐ کا انتقال ہونے والا تھا۔ انھوں نے دو مرتبہ آکر قرآن کا

مقابلہ کیا اور زید بن ثابت نے اسی سال قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی لہٰذا وُہ اس مقابلہ کے نتیجہ پر مطلع تھے جو اس سال ہُوا تھا اور اس لیے اُن کی جمع و ترتیب بالکل اسی جمع و ترتیب کے موافق تھی جس پر رسالت مآبؐ کا اپنی زندگی کے آخری دَور میں عملدرآمد رہا اور جس طرح وُہ اپنے آخر وقت تک قرآن کی تلاوت فرماتے تھے بخلاف ابی بن کعب اور ابن مسعود وغیرہ دیگر صحابہ کے کیونکہ ابن مسعود نے مکہ میں قرآن حفظ کیا تھا اور وہیں رسالت مآبؐ کو پڑھ کر سُنایا تھا اور ابی بن کعب نے ہجرت کے بعد اور اسی زمانہ میں رسالت مآبؐ کو سُنایا تھا۔

(ملاحظہ ہو اعجاز القرآن صفحہ ۲۶، ۲۷)

لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہ توجیہ صرف خوش عقیدگی کا نتیجہ اور دل کو تسکین دے لینے کا ذریعہ ہے اور مستند احادیث و واقعات کی بنا پر اُس کا کوئی وزن معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس موقع پر جب حضرت ابوبکر نے جمع قرآن کا کام زید بن ثابت کے سپرد کیا ہے اور اُن کو بُلا کر اس امر پر مامور فرمایا ہے تو جو وجوہ ترجیح اُن کے لیے بتلائے گئے وُہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔

اُس وقت جو کچھ بھی ارشاد ہُوا تھا وُہ یہ کہ انك شاب عاقل لانتہمك وقد كنت تكتب الوحى لرسول الله صلى الله عليه وسلم۔ "تم نوعمر عقلمند آدمی ہو تم پر ہم کو اطمینان ہے اور تم رسالت مآبؐ کے پاس کاتبِ وحی بھی رہ چکے ہو۔"

بھلا اگر زید بن ثابت کے لیے ایک اتنی بڑی خصوصیت حاصل ہوتی کہ وُہ عرضۂ اخیرہ (آخری مقابلہ قرآن میں) موجود تھے تو اس موقع پر اُس کا تذکرہ نہ کیا جاتا اور یہ نہ کہا جاتا کہ تم عرضۂ اخیرہ میں موجود تھے؟

یہی امتیاز وُہ ہوتا جو مقامِ ترجیح میں اُن کے اختصاص کا ضامن ہوتا، اس کو چھوڑ کر یہ کہنے کا کون سا موقع تھا کہ تم نوعمر ہو؟ کیا نوعمر ہونا اتنی بڑی ذمہ داری کے استحقاق کی ضمانت ہے؟

یہ ایک باریک مسئلہ ہے کہ منصبِ خلافت کے لیے تو سن رسیدہ ہونا وجہ ترجیح سمجھا جائے اور جمع قرآن کے موقع پر جواں سال ہونا اختصاص کی دلیل، رہ گئی عقل اس سے غالباً دُوسرے



صحابہ بھی محروم نہ تھے، "ہم تم کو متہم (ناقابلِ اعتماد) نہیں سمجھتے" یعنے کیا دُوسرے صحابہ جتنے ہیں وُہ متہم اور ناقابلِ اعتماد ہیں؟ پھر آخر احکام شرعیہ تو عام مسلمانوں کو انہی صحابہ کے ذریعہ سے پہنچے ہیں۔ اُن تمام احکام کا حشر کیا ہوگا؟ کاتبِ وحی ہونے کی فضیلت بھی مخصوص نہیں بلکہ بہت سے صحابہ اُس میں شرکت کے دعویدار ہو جائیں گے۔

پھر حضرت ابوبکر کا یہ فرمانا فتتبع القرآن فاجمعه "قرآن کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کرو" یہ صاف اس امر کی دلیل ہے کہ زید بن ثابت کو قرآن مجید حفظ نہ تھا اور نہ وُہ اس ترتیب پر مطلع تھے جس پر آخری مرتبہ عرضِ قرآن ہُوا تھا ورنہ اُن کو تتبع کے بعد جمع کا حکم نہ ہوتا بلکہ یہ کہا جاتا کہ اُسی صُورت پر جو تمہارے سینہ میں موجود ہے قرآن جمع کر دو۔

اور پھر زید بن ثابت نے جو صورت جمع کی بتلائی ہے "فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال" "میں نے قرآن کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر درخت کی چھالوں اور پتھر کے ٹکڑوں اور مختلف اشخاص کے محفوظات سے جمع کیا" یہ بھی صریحی دلیل ہے کہ وُہ حافظِ قرآن نہ تھے۔ باوجود زید بن ثابت کے اس اعتراف کے جو صحیح بخاری ایسی کتاب میں موجود ہے کیا سادہ لوحی نہیں ہے کہ اُن کو حافظِ قرآن اور صاحب عرضۂ اخیرہ ہونے کی وجہ سے جمع قرآن کا حقدار سمجھا جائے۔

یہ کہنا کہ ابن مسعود نے مکہ معظمہ میں قرآن حفظ کیا تھا اور رسالت مآبؐ کو پڑھ کر سُنایا تھا اور ابی بن کعب نے ہجرت کے بعد مدینہ میں جیسا کہ علامہ رافعی نے تحریر کیا ہے عجیب چیز ہے لے حضرت مکہ میں قرآن پورا نازل ہی کب ہُوا تھا جو ابن مسعود وہاں حفظ کرتے اور رسالتمآبؐ کو سُناتے اور اسی طرح مدینہ کے ابتدائی دَور میں پورا قرآن کہاں موجود تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مکہ میں جتنا قرآن نازل ہُوا تھا وُہ مکہ میں یاد کیا اور پڑھ کر سُنایا تھا اور پھر رسالتمآبؐ کے آخر زمانۂ حیات تک جتنا جتنا نازل ہوتا گیا اتنا اتنا یاد کر کے سناتے گئے اس طرح خدمتِ رسُولؐ میں اُن کے ابتدائی تعلیم پانے کا زمانہ عرضۂ اخیرہ تک پہنچتا ہے اور اس موقع پر جو کچھ تغیر و تبدل ہُوا ہوگا وُہ حضرت کی جانب سے عبداللہ بن مسعود و ابی بن کعب کو بھی خاص طور پر بتلایا گیا ہوگا خصوصاً جبکہ حضرت کی توجہ ان دونوں صحابیوں کو تعلیم قرآن دینے کے متعلق

خاص طور سے مبذول تھی یہاں تک کہ ابی بن کعب کے متعلق حضرت نے یہاں تک فرمایا کہ امرت ان اقرأ علیك القرآن "مجھ کو خدا کا حکم ہوا ہے کہ میں تمہیں قرآن پڑھ کر سناؤں" اور بعض روایات میں ہے اعرض علیك القرآن اور اسی بناء پر حضرت نے تمام صحابۂ کرام میں اُن کو مخصوص امتیاز دے کر فرمایا۔ اقرأ امتی ابی "میری امت میں سب سے بہتر حافظ قرآن ابی ہیں" اور خود حضرت عمر کی یہ روایت متعدد طرق سے نقل ہوئی ہے کہ اقضانا علی واقرانا ابی "ہم میں سب سے بہتر قاضی علیؑ ہیں اور سب سے بہتر حافظِ قرآن ابی ہیں" (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو استیعاب ابن عبدالبر برحاشیہ اصابہ مطبوعہ مصر ج ۱ صـ۲۸)

اور عبداللہ بن مسعود کے متعلق حضرت کا ارشاد تھا من سرّہٗ ان یقرأ القرآن غضًا کما انزل فلیقرأ علی ابن ام عبد "جو شخص چاہتا ہو کہ قرآن مجید کی بالکل تر و تازہ صورت پر جس طرح نازل ہوا ہے تعلیم حاصل کرے تو وہ اُس کو ابنِ مسعود سے پڑھے۔ اس روایت کی حافظ نسائی نے حضرت عمر سے تخریج کی ہے اور حافظ ابن حجر نے اصابہ ج ۲ صـ۳۶۲ اور ابن عبدالبر نے استیعاب مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ج ۱ صـ۳۷۱ اور ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ ج ۴ صـ۹۶ میں اُس کو درج کیا ہے اور پھر اُن صحابہ میں کہ جن سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کا رسالت مآبؐ نے حکم دیا تھا۔ عبداللہ بن مسعود کا پہلا نمبر ہے چنانچہ عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول خذوا القرآن من اربعۃ من ابن ام عبد فبدأ بہ ومعاذ بن جبل وابی بن کعب وسالم مولی ابی حذیفۃ "میں نے رسالت مآبؐ کو فرماتے سنا کہ قرآن کی تعلیم چار آدمیوں سے حاصل کرو اور اُن میں سب سے پہلے ابنِ مسعود کا نام لیا۔"

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ان صحابہ میں کہیں زید بن ثابت کا نام نہیں اور نہ حضرت رسول اکرمؐ نے حافظِ قرآن ہونے کی حیثیت سے کبھی اُن کی تعریف کی ہے بے شک اُن کی مدح میں جو فقرہ ائمۂ حدیث نے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ افرضکم زید بن ثابت "تم میں علمِ میراث کے جاننے والے سب سے زیادہ زید بن ثابت ہیں۔" لیکن اس کو حفظِ قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اور پھر ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس نے تو مذکورۂ بالا خیال کا تار و پود بکھیر کر حقیقت کو





بالکل واضح کر دیا ہے، اُن کا بیان ہے کہ عرضۂ اخیرہ میں حاضر ہونے والے عبداللہ بن مسعود تھے نہ زید بن ثابت چنانچہ ہم اس روایت کو استیعاب ابن عبدالبر سے نقل کرتے ہیں۔

روی وکیع وجماعۃ معہ عن الاعمش عن ابی ظبیان قال قال لی عبداللہ بن عباس ای القراء تین تقرأ قلت القراءۃ الاولی قراءۃ ابن ام عبد فقال لی اجل ھی الاخرۃ ان رسول اللہؐ کان یعرض القرآن علی جبرئیل فی کل عام مرۃ فلما کان العام الذی قبض فیہ رسول اللہؐ عرضہ علیہ مرتین فحضر ذلك عبداللہ فعلم ما نسخ من ذلك وبدل۔ (مطبوعہ حیدرآباد ج ۱ صـ۳۷۲)

"وکیع اور ایک جماعت نے اعمش کی زبانی ابو ظبیان سے نقل کیا ہے کہ مجھ سے عبداللہ بن عباس نے کہا تم کس قرارت کے ساتھ قرآن پڑھتے ہو۔ میں نے کہا سب سے مقدم یعنی ابن مسعود کی قرارت، انھوں نے کہا ہاں اور وہی سب سے آخری بھی ہے جناب رسالت مآبؐ جبرئیل کے ساتھ ہر سال ایک مرتبہ قرآن کا مقابلہ کرتے تھے لیکن جس سال حضرت کا انتقال ہوا تو دو مرتبہ قرآن کو پیش کیا گیا۔ اس موقع پر عبداللہ موجود تھے اور جو کچھ تغیر و تبدل ہوا سب پر مطلع ہوئے۔"

اسی کے مطابق حافظ جلال الدین سیوطی نے درِ منثور میں حسبِ ذیل روایات نقل کیے ہیں:

(۱) اخرج ابن الانباری عن مجاھد قال قال لنا ابن عباس ای القراءتین تعدون اول قلنا قراءۃ عبداللہ قال فان رسول اللہ کان یعرض القرآن علی جبرئیل مرۃ وانہ عرضہ علیہ فی اخر سنتہ مرتین فقراءۃ عبداللہ اخر

"ابن انباری نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ ہم سے ابن عباس نے کہا تم لوگ دونوں قراءتوں میں سے کس کو اوّل شمار کرتے ہو؟"

ہم نے کہا ابن مسعود کی قرارت کو فرمایا رسالت مآبؐ قرآن کا جبرئیل کے ساتھ ایک مرتبہ مقابلہ کیا کرتے تھے اور اپنی زندگی کے آخری سال آپ نے دو مرتبہ اُن کے ساتھ مقابلہ کیا تو عبداللہ کی قرارت سب سے آخر تھی۔"

(۲) اخرج ابن الانباری عن ابن مسعود قال کان جبرئیل یعارض النبیؐ

بالقرآن فی کل سنة مرة وانه عارضه بالقرآن فی اٰخر سنة مرتین فاخذته من النبی ذٰلك العام۔

"ابن مسعود کا خود بیان ہے کہ جبریل ہر سال قرآن کا ایک مرتبہ رسالتمآبؐ سے مقابلہ کراتے تھے اور اُنھوں نے آخری سال دو مرتبہ مقابلہ کیا اور مَیں نے اس سال قرآن کو جناب رسالتمآبؐ سے اخذ کیا ہے۔"

(۳) عن ابن مسعود قال لو اعلم احدا احدث بالعرضة الاخیرة منّی لرحلت الیه۔

"ابن مسعود کہتے تھے کہ اگر مَیں جانتا کوئی صحابی عرضۂ اخیرہ میں میرے بعد حاضر ہُوا ہے تو مَیں ضرور اس کے پاس قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کو جاتا۔"

اب ان روایات کی موجودگی میں اس خیال کا کیا وزن باقی رہ سکتا ہے کہ عرضۂ اخیرہ میں شریک ہونے والے زید بن ثابت تھے اور پھر جب کہ وُہ کسی روایت کی طرف مستند نہیں ہے بلکہ لوگوں کا ذاتی خیال ہے جس کو ابن سیرین نے عرضۂ اخیرہ کی کیفیت کے بعد اس طرح بیان کیا ہے کہ۔ فیرون ان تکون قراءتنا هٰذه علی العرضة الاخیرة۔

"لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہماری موجودہ قرأت اسی عرضۂ اخیرہ کے مطابق ہے۔"

(درمنثور ج ۱ ص۱۰)

کوئی بتلائے کہ مذکورہ صورتِ حال میں آخر زید بن ثابت کے جمع کردہ قرآن پر تمام دُوسرے صحابہ کی مخالفت کے باوجود اعتماد کی کیا وجہ ہے؟ اور پھر اعتماد بھی ایسا کہ جتنے قرآن دُوسرے صحابہ کرام کے تھے وُہ صفحۂ دُنیا سے معدوم کر دیئے جائیں اور اُن کو آگ کے اُٹھتے ہُوئے شعلوں کی نذر ہونا پڑے۔

خیر ابھی تک واقعات کا سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ حضرت عثمان نے اسی قرآن کے اجزا کو جو حضرت ابوبکر کے زمانہ میں جمع کیے گئے تھے، حفصہ کے پاس سے منگا کر نقل کرا لیا تھا اور مقابلہ کے بعد حفصہ کو واپس کر دیئے گئے اور اس طرح وُہ نسخۂ اصل اور یہ تمام اُس کے نقول تھے جو مختلف بلاد کی جانب روانہ کئے گئے۔

 

لیکن اس کے بعد واقعہ کی نیرنگی زیادہ اور دیکھنے والے کی حیرانی میں اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حفصہ بنت عمر کے انتقال کے بعد حضرت عثمان نے وُہ اجزائے قرآن جو اُن کے پاس موجود تھے عبداللہ بن عمر سے بڑے اصرار کے ساتھ منگوا کر اُنھیں پانی سے دُھلوا ڈالا۔ اس واقعہ کا تذکرہ کتاب "التعریف بالنبی والقرآن الشریف" مطبوعہ مصر ۱۹۵۰ء میں حسب ذیل الفاظ میں موجود ہے۔ فکتبوا المصحف واستعرضوه عرضة بعد اخری فلما لم یجدوا شیئا ارسل عثمان الی ام المؤمنین حفصة بسألها ان ترسل الیه المصحف لعرض المصحف علیها وحلف لها لیردنها الیها بعد مقابلة المصحف بها فاعطته ایاها فعرض علیها المصحف فلم یختلفا فی شیء فردها الیها وطابت نفسه بما فعل وامر الناس ان یکتبوا مصاحف فلما ماتت حفصة ارسل عثمان الی عبدالله بن عمر یطلب الصحف منه وشدد فی طلبها فاعطاه عبدالله ایاها فغسلها غسلا۔

"اُن صحابہ نے مصحف کو لکھا اور چند مرتبہ اُس پر نظر کی گئی جب کوئی غلطی نہ ملی تو عثمان نے ام المومنین حفصہ کے پاس کہلوا بھیجا کہ وُہ اجزائے قرآن بھیج دیجیے تاکہ مصحف کا مقابلہ اُن کے ساتھ ہو جائے اور قسم کھائی کہ مَیں مقابلہ کے بعد واپس کر دوں گا چنانچہ حفصہ نے اُن کو بھیج دیا اور مصحف کا اُن سے مقابلہ کیا گیا تو ذرا سا بھی اختلاف دونوں میں نہ نکلا۔ اس وقت حضرت عثمان کو اطمینان حاصل ہُوا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وُہ اس مصحف کے نقول تحریر کریں۔ جب حفصہ کا انتقال ہُوا تو حضرتِ عثمان نے عبداللہ بن عمر کے پاس آدمی بھیجا کہ وُہ اُن اجزاء کو بھیج دیں اور بڑی سختی کے ساتھ اُن سے مطالبہ کیا اُس وقت اُنھوں نے (مجبور ہو کر) وُہ اجزاء بھیج دیئے اور حضرت عثمان نے پانی سے اُن کو دھلوا ڈالا۔"

دُنیائے علم و تمدن کی سیر کرو۔ شرق و غرب کے علمی اداروں پر نظر کرو اور علم دوست و علم پرور اقوام کی جد و جہد کا جائزہ لو، تم کو اندازہ ہو گا کہ کسی کتاب کے اصل نسخہ کی کتنی قدر و قیمت ہے اور اس کا وجود اُس کے شائع شدہ نقول کے اعتبار میں کتنی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں روپیہ صرف کر کے مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہُوئی تحریریں یا اُس زمانہ کے

نقل شدہ نسخے یا قدیم سے قدیم کتبے حاصل کرنا اور اُن کو انتہائی اہتمام و انتظام کے ساتھ محفوظ رکھنا اسی غرض کے لیے ہے۔

کتاب کے قدیمی نسخہ کا جو کہیں دستیاب ہوگیا ہے فوٹو چھاپ کر شائع کرنا جو اب مطابع یورپ و جرمن اور اُن کی تقلید میں مصر و بیروت کا طرۂ امتیاز بنا ہُوا ہے اسی لیے ہے کہ اس میں کسی قسم کے تصرف و تغیر کے احتمال کا سدباب ہو جائے۔

کیا اس کے برخلاف کوشش کے ساتھ نسخۂ اصل کو حاصل کر کے تلف کر دینا اور اُس کو دُنیا کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل کر دینا کسی صحیح فلسفہ پر مبنی سمجھا جا سکتا ہے؟ کیا اس وجہ سے قرآن مجید کے متعلق طرح طرح کے شُبہے پیدا کیے جانے کا امکان نہ ہوگیا اور اس کے سند و اعتبار کو صدمہ نہ پہنچا۔

اور پھر اس پر طرّہ یہ کہ محدثینِ اُمت نے جو حفاظ و ائمہ و اصحابِ سنن ایسے القاب سے سرفراز ہیں اپنے جوامع حدیث و سیر میں ایسے روایات درج کر دیئے ہیں جن میں حضرت عثمان اور اُن کے اشاعت دادہ موجود قرآن پر حسبِ ذیل الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ (۱) یہ کہ اس قرآن میں کتابت کی غلطیاں موجود ہیں اور وُہ اسی غلط صُورت پر متواتر ہو کر دُنیائے اسلام میں شائع ہے (۲) یہ کہ حضرت عثمان کو خود بعض اغلاط کا احساس ہُوا جس کو انھوں نے پہلی فرصت میں تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ بعد کے حوالہ کیا جس کا پھر موقع نہ ملا اور وُہ اب تک باقی ہیں (۳) یہ کہ حضرت عثمان نے قرآن میں تغیر و تبدیل کی اور اس کو پہلی صُورت پر باقی نہیں رکھا۔

اب کیا اگر اصلی نسخہ قرآن مجید کا یعنی حضرت ابوبکر کے زمانہ کا جمع کردہ موجود ہوتا تو حضرت عثمان اور اُن کی طرف منسوب شدہ قرآن پر سے ان الزامات کے رفع ہو جانے کا امکان نہ تھا؟

کیا اس صورت میں اگر ایک معترض کے دل میں مذکورہ بالا احادیث کی بناء پر شبہ پیدا ہوتا اور وُہ تحقیق کے خیال سے اُن کی جستجو چاہتا تو اسے اطمینان حاصل کر لینے کا ایک بہترین ذریعہ نہ موجود ہوتا؟ یقیناً اُس وقت ایک دلدادۂ تحقیق کے لیے بہترین صورت یہ تھی کہ وُہ اُس قرآن کی مطابقت کر کے اُن تمام شکوک سے نجات پا جائے جو موجودہ قرآن کے متعلق پیدا ہوتے ہیں

پھر جب ایسا نہ ہُوا اور بڑی کاوش کے ساتھ اُس قرآن کو دُنیا سے نابود کرنے کا انتظام کیا گیا





تو کیا یہ صورت مذکورہ بالا روایات کے مفاد کو زیادہ تقویت نہیں پہنچاتی اور اس طرح شکوک و شبہات کے دامن کو وسیع سے وسیع تر نہیں بناتی۔

## قرآن میں کتابت کی غلطیاں

ملاحظہ ہو حافظ شام جلال الدین سیوطی کی کتاب (اتقان فی علوم القرآن) ج ۱ صفحہ ۱۸۳، ۱۸۴

قال ابو عبید فی فضائل القرآن حدثنا ابو معاویة عن هشام بن عروة عن ابیه قال سألت عائشة عن لحن القرآن عن قوله تعالیٰ ان هذان لساحران وعن قوله تعالیٰ والمقیمین الصلوٰة والموتون الزکوٰة وعن قوله تعالیٰ ان الذین امنوا والذین هادوا والصابئون فقالت یا ابن اختی هذا عمل الکتّاب اخطئوا فی الکتب۔ هذا اسناد صحیح علی شرط الشیخین۔

عُروہ بن زبیر کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ سے قرآن کی موجودہ غلطیوں کے متعلق سوال کیا جو ان آیات میں ہیں۔ ان هذان لساحران والمقیمین الصلوٰة والموتون الزکوٰة۔ ان الذین امنوا والذین هادوا والصابئون۔ انھوں نے فرمایا اے فرزند خواہر یہ کاتبوں کی کارستانی ہے، انھوں نے کتابت میں غلطی کی۔ سند اس روایت کی اُن شرائط کے مطابق جو شیخین (بخاری و مسلم) نے قرار دیئے ہیں صحیح ہے۔

## دُوسری روایت

قال (ابوعبید) حدثنا حجاج عن هرون بن موسیٰ اخبرنی الزبیر بن الخریت عن عکرمة قال لما کتبت المصاحف عرضت علی عثمان فوجد فیها حروفا من اللحن فقال لا تغیروها فان العرب ستغیرها او قال ستعربها بالسنتها لو کان الکاتب من ثقیف والمملی من هذیل لم توجد فیه هذه الحروف اخرجه ابن الانباری فی کتاب الرد علی من خالف مصحف عثمان وابن اشته فی کتاب المصاحف ثم اخرج ابن الانباری نحوه من طریق عبد الاعلیٰ بن عبد الله بن عامر وابن اشته نحوه من طریق یحیی بن یعمر۔

عکرمہ کا بیان ہے کہ جب مصاحف لکھے گئے اور حضرت عثمان کے سامنے پیش ہُوئے تو ان میں بعض حروف غلط نظر آئے، عثمان نے فرمایا کہ اب انھیں تغیر نہ دو، عرب اہل زبان خود

انھیں (سمجھ کر) تغیر دے لیں گے یا یوں کہا کہ وُہ لوگ اپنے محاورہ کے مطابق خود بنا لیں گے اگر لکھنے والا قبیلۂ ثقیف سے اور بولتا جانے والا قبیلہ ہذیل سے ہوتا تو یہ غلطیاں پائی نہ جاتیں اس روایت کو ابن انباری نے اپنی کتاب میں اور ابن اشتہ نے کتاب المصاحف میں بھی دو طریقوں سے درج کیا ہے۔

## تیسری روایت

اخرج (ابن الانباری) من طریق ابی عشر عن سعید بن جبیر انہ کان یقرأ والمقیمین الصلوٰۃ ویقول ھو لحن من الکتاب۔

سعید بن جبیر والمقیمین الصلوٰۃ کو پڑھ کر کہتے تھے کہ یہ کاتبوں کی غلطی ہے۔

اب کچھ نہ پوچھو کہ ان روایات کو نقل کرنے کے بعد کیا ہلچل مچی ہے۔ کوئی کہتا ہے۔

(یہ احادیث تو بڑے مشکل ہیں، بھلا صحابہ نحوی غلطی کر سکتے ہیں، اُن کے تو گھٹی میں فصاحت پڑی ہُوئی تھی، اُن سے غلطی کا امکان کہاں ہے۔

(کون کہے وُہ ایسے فصیح اللسان تھے کہ ایک محاورے سے دُوسرے محاورہ پر اُن کی زبان نہیں پلٹتی تھی اسی لیے سات حرفوں کی ضرورت ہُوئی اور پھر آخری دَور میں فتوحاتِ ایران کے بعد سے زبان پر اتنا اثر پڑا تھا کہ علم نحو کے وضع کی ضرورت محسوس ہُوئی)

اور پھر خصوصیت سے قرآن مجید کو تو اُنھوں نے رسالت مآبؐ سے تنزیل کے مطابق حاصل کیا تھا اور اس کو پوری احتیاط کے ساتھ حفظ کر لیا تھا۔ پھر اس میں غلطی کیوں کرتے۔

(عام صحابہ کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ اُنھوں نے قرآن کو رسالت مآبؐ سے حاصل کیا تھا، رہ گئے مخصوص لوگ جنھوں نے رسُولؐ سے حقیقۃً قرآن اخذ کیا تھا وُہ مذکورۂ بالا الفاظ پر متفق نہ تھے بلکہ اُن میں پھُوٹ پڑی ہُوئی تھی چنانچہ تفسیر خازن بغدادی مطبوعۂ مصر ج ۲ ص ۱۲ میں ہے۔

والصابئون ظاھر الاعراب یقتضی ان یقال والصابئین وکذا قراءۃ ابی بن کعب وابن مسعود وابن کثیر من السبعۃ۔ صابئون ترکیب نحوی کا اقتضاء بظاہر یہ ہے کہ والصابئین ہو اور ابی بن کعب وابن مسعود اور قراء سبعہ میں سے ابن





کثیر اسی طرح پڑھا کرتے تھے۔)

پھر یہ کیسے خیال کیا جا سکتا ہے کہ وُہ سب غلطی پر مجتمع ہو گئے تھے اور اُن کو اس کے بعد خیال بھی نہ آیا کہ وہ اُس کی اصلاح کرتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو دو سو نا معلوم کتنے کاتب تھے جن کا اجتماع خطا پر محال ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وُہ چار سے زیادہ نہ تھے، کتابت کی غلطی سے کوئی عالم و فاضل فصیح بلیغ مستثنیٰ نہیں ہے۔ پہلے کاتب سے غلطیاں ہُوئیں دُوسروں نے اسی کا اتباع کیا لکھتے وقت لکھنے والے کی توجہ زیادہ تر نقل نویسی کی طرف اس طرح منعطف ہوتی ہے کہ اُس کو اکثر الفاظ کے معانی کا تصور بھی نہیں ہوتا اور پھر جب کہ پہلی کتابت کے ساتھ حسنِ ظن بھی اتنا ہو کہ منظور یہ ہے کہ دُوسرا نسخہ اُس کے بالکل مطابق ہو اور ایک شوشہ کا اختلاف نہ ہونے پائے، جس کی تصدیق اس رسم الخط سے ہوتی ہے جو قرآن کی کتابت میں رائج ہے حالانکہ اُس میں بعض چیزیں یقیناً قواعدِ کتابت کے خلاف ہیں جیسے لا اذبحنہ اور لا اوضعوا وغیرہ مگر کیا مجال کہ کاتبانِ قرآن اس الف کو ترک کر دیں) پھر یہ کیونکر گمان کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمان اس کے تغیر دینے سے منع کرتے۔

(کسی کتاب کی تصحیح کے وقت خصوصاً جبکہ تعجیل مدنظر ہو اس امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ایسی غلطیاں جن کا اندازہ مطالعہ کرنے والوں کو ذرا دقت سے ہوتا ہے دُور کر دی جائیں، لیکن ایسی صریح غلطیاں جن کو ہر شخص دیکھ کر سمجھ سکتا ہے ترک کر دی جاتی ہیں کہ دیکھنے والا خود ہی اُن کی تصحیح کرے گا، حضرت عثمان کے جواب میں یہی خیال مضمر معلوم ہوتا ہے وُہ فرماتے ہیں کہ ان غلطیوں کی تصحیح کی ضرورت نہیں، عرب اہلِ زبان ہیں وہ خود اُن کا احساس کر کے انھیں اپنے محاورہ کے مطابق درست کر لیں گے لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ عام افراد اہلِ اسلام پر اُن کے اور اُن کے مامور کردہ جامعینِ قرآن کے ساتھ حسنِ ظن کچھ ایسا غالب آ جائے گا کہ وُہ اس کو تو اس کو جو اس سے زیادہ معمولی غلطیاں ہیں جیسے لا اذبحنہ کا الف اُس کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رکھ کر ابتدائی جمع قرآن کی یاد تازہ رکھیں گے)

پھر کیوں کر گمان ہو سکتا ہے کہ قرات اسی غلطی کے موافق باقی رہی حالانکہ وُہ برابر تواتر کے

ساتھ نقل ہوتا رہا ہے (یہ اُسی صورت سے باقی رہی کہ جیسے املاء کی غلطیاں برابر باقی رہیں اور وُہ تواتر کے ساتھ اب تک موجود ہیں) یہ ایسی بات ہے جو عقلاً اور شرعاً اور عادۃً محال ہے۔ دغور کرنے کی ضرورت ہے ورنہ مذکورہ بالا وجوہ و اسباب اور نظائر کو دیکھتے ہوئے وُہ کسی حیثیت سے محال نہیں ہے)

کوئی کہتا ہے کہ یہ روایات ضعیف السند ہیں قابلِ عمل نہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ لحن سے مراد وُہ مقامات ہیں جہاں رمز و کنایہ کے طور پر مطالب ذکر ہوئے ہیں۔ کسی کا مقولہ ہے کہ غلطیاں سے مراد املاء کی غلطیاں ہیں جیسے لا اذبحنہ وغیرہ اور اُن کے تصحیح کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن علامہ سیوطی نے ان جوابات کے نقل کرنے کے بعد لکھ دیا ہے هذه الاجوبة لایصلح منها شیئ عن حدیث عائشة اما الجواب بالتضعیف فلان اسناده صحیح کما ترٰی واما الجواب بالرمز وما بعده فلان سوال عروة عن الاحرف المذكورة لایطابقه۔

"ان جوابوں میں سے کوئی بھی حضرت عائشہ کی حدیث کے متعلق صحیح نہیں ہے اس لیے کہ سند اس کی صحیح ہے لہٰذا ضعفِ سند کا بہانہ ہو نہیں سکتا اور رمز و اشارہ والے جواب کا بھی موقع نہیں کیونکہ اس میں عروہ کا سوال خاص آیات کے متعلق ہے جن میں اعراب کی غلطیوں کو ظاہر کیا گیا تھا۔

ابن اشتہ کہتے ہیں کہ "مراد حضرت عائشہ کی یہ ہے کہ ان لوگوں نے قراءت سبعہ میں سے موجودہ قراءت کے انتخاب میں غلطی کی ہے نہ یہ کہ جو موجودہ قراءت ہے وُہ بالکل غلط اور ناجائز ہے"۔ لیکن سوال و جواب پر نظر ڈالنے سے یہ تاویل بالکل بودی ثابت ہوتی ہے۔ عروہ بن زبیر نے مذکورہ بالا آیات میں غلط اعراب کے متعلق سوال کیا تھا حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ هٰذا عمل الکتّاب "یہ کاتبوں کی کارستانی ہے" اگر موجودہ الفاظ بھی حروفِ سبعہ میں سے ہوتے اور حروفِ سبعہ کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ وُہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہیں تو وُہ کاتبوں کی کارستانی نہیں کہے جاسکتے بلکہ وُہ بھی خدا کی نازل کردہ ہیں۔ اس کے متعلق یہ جواب کافی تھا کہ یہ بھی بعض لغات عرب میں محاورہ ہے اور اس بناء پر حروفِ سبعہ میں سے ایک حرف کے مطابق ہے اور پھر





انتخابِ قراءت میں غلطی یہ جامعِ قرآن یا اختیار کنندگان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کو کاتبوں کی طرف منسوب کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

بعض نے گھبرا کر آیاتِ مذکورہ کی توجیہ کے لیے سیبویہ و اخفش و خلیل وغیرہ کو اکٹھا کرنا اور کلیات ابوالبقاء کو الٹنا شروع کر دیا ہے اور مندرجہ الفاظ کی توجیہ کے لیے نحویین کے اقوال و احتمالات سے مدد لی ہے لیکن افسوس ہے کہ ان اقوال و توجیہات میں سے کوئی بھی حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ کی روایت کا درماں نہیں ہے بلکہ درحقیقت ان تاویلات میں حضرت اُمّ المؤمنین کے ارشاد کی تکذیب اور اُن کی خدمت میں سوءِ ادب مضمر ہے، کیا وُہ معظمہ قواعدِ عرب اور اصُولِ نحو سے واقف نہ تھیں یا وُہ جان بوجھ کر حضرت عثمان کی عداوت میں صحیح الفاظ کو غلط بتلا رہی تھیں؟

درحقیقت یہ قواعد و اصُول تو بعد میں ایجاد ہوئے ہیں اور اکثر خود قرآن مجید کے آیات کو دیکھ کر اور اُن سے استفادہ کر کے اور حضرت ام المؤمنین عائشہ اپنی ذاتی اطلاع کی بناء پر الفاظِ مذکورہ کو غلط نویس کاتبوں کی کارستانی بتلا رہی تھیں۔ پھر موصوفہ کے قول کے سامنے نحویین کے توجیہات پیش کرنے سے کیا نتیجہ؟

## چوتھی روایت
## تحریف کا صریحی اقرار

الامام احمد فی مسنده وابن اشته فی المصاحف من طریق اسماعیل المکی عن ابی خلف مولٰی بنی جمح انه دخل مع عبید بن عمیر علی عائشة فقال جئت اسألك عن اٰیة فی کتاب الله تعالٰی کیف کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقرأها قالت ایة اٰیة قال الذین یأتون ما اتوا او الذین یؤتون ما اٰتوا فقالت ایتهما احب الیك قلت والذی نفسی بیده لاحدهما احب الیّ من الدنیا جمیعا قالت ایهما قلت الذین یأتون ما اتوا فقالت اشهد ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کذٰلك کان یقرأها وکذٰلك انزلت ولٰکن الهجاء حرّف۔

امام احمد بن حنبل نے مسند میں اور ابن اشتہ نے کتاب المصاحف میں اسماعیل مکی کے

طریق سے ابو خلف جمحی سے روایت کی ہے کہ وہ عبید بن عمیر کی معیت میں حضرت عائشہ کے پاس گئے اور کہا کہ اس آیت کے متعلق دریافت کرنے آیا ہوں کہ رسالت مآبؐ اس کو کیونکر پڑھا کرتے تھے "الذین یاتون ما اتوا" یا "الذین یؤتون ما اتوا"؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ تمھیں زیادہ کیا اچھا معلوم ہوتا ہے اُنھوں نے کہا "الذین یاتون ما اتوا" معظمہ نے فرمایا میں گواہی دیتی ہوں کہ میں نے جناب رسالت مآبؐ کو اسی طرح پڑھتے سُنا اور وہ اسی طرح نازل ہوئی تھی۔ لیکن حروفِ ہجا میں الفاظ کے تحریف کر دی گئی ہے۔

**پانچویں روایت**

ابن جریر و سعید بن منصور فی سنتہ من طریق سعید بن جبیر عن ابن عباس فی قولہ حتّٰی تستانسوا وتسلموا قال انما ھی خطأ من الکاتب حتی تستاذنوا وتسلموا۔

ابن عباس کا بیان ہے کہ حتّٰی تستانسوا وتسلموا کاتب کی غلطی ہے اصل یوں ہے کہ حتی تستاذنوا وتسلموا

**چھٹی روایت**

ابن انباری نے بطریق عکرمہ ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی افلم یتبین الذین اٰمنوا ان لو یشاء اللہ لھدی الناس جمیعاً کسی نے کہا کہ مصحف میں تو یوں ہے کہ افلم ییئس الذین اٰمنوا الخ ابن عباس نے کہا اظن الکاتب کتبھا دھو ناعس میرا خیال یہ ہے کہ کاتب نے اس جملہ کو اونگھ میں لکھا ہے۔

**ساتویں روایت**

سعید بن منصور من طریق سعید بن جبیر عن ابن عباس انہ کان یقول فی قولہ تعالٰی وقضٰی ربك انما ھی ووصّٰی ربك التزقت الواو بالصّاد۔

ابن عباس اس آیت کے متعلق کہ وقضٰی ربك کہتے تھے یہ اصل میں ووصّٰی ربك تھا کتابت میں واؤ صاد سے متصل ہوگیا۔

ابن اشتہ نے اس کو بایں الفاظ نقل کیا ہے کہ استمد الکاتب مدادا کثیرا فالتزقت الواوُ بالصاد۔





کاتب نے روشنائی قلم میں زیادہ لے لی جس کی وجہ سے واؤ صاد سے متصل ہوگیا۔

**آٹھویں روایت**

ابن اشتہ نے ضحاک سے روایت کی ہے کہ انھوں نے قرآن میں اس آیت کو نکال کر کسی کے سامنے پیش کیا کہ تم اسے کیوں کر پڑھتے ہو؟ اس نے کہا وقضٰی ربك ضحاک نے کہا کہ ہم تو اس طرح نہیں پڑھتے اور نہ ابن عباس بلکہ اصل میں یہ ووصّٰی ربك ہے اور یوں ہی وہ ہمیشہ پڑھی اور لکھی جاتی تھی (یعنی حضرت عثمان والے جمع قرآن کے قبل) لیکن کاتب نے روشنائی قلم میں زیادہ لے لی جس سے واؤ صاد سے متصل ہوگیا جس طرح خدا نے فرمایا ہے ولقد وصینا الذین اوتوا الکتاب من قبلکم وایاکم ان اتقوا اللہ۔ اور بھلا اگر خداوند عالم کے قضاؤ قدر میں گذر جاتا کہ لوگ عبادت کریں تو کوئی اس کے قضا کی مخالفت کب کر سکتا ہے بلکہ یہ درحقیقت ہدایت ہے جو اس نے بندوں کو کی ہے۔

**نویں روایت**

سعید بن منصور وغیرہ من طریق عمرو بن دینار عن عکرمۃ عن ابن عباس انہ کان یقرأ ولقد اٰتینا موسٰی وھٰرون الفرقان ضیاء ویقول خذوا ھذہ الواو واجعلوھا ھٰھنا والذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم الاٰیۃ

ابن عباس اس آیت کو پڑھتے تھے کہ "ولقد اٰتینا موسٰی وھٰرون الفرقان ضیاء ویقول خذوا ھٰذہ الواو واجعلوھا ھٰھنا والذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ولقد اٰتینا والی آیت کے شروع میں واؤ زیادہ اور الذین قال لھم الناس میں واو کم ہے۔

**دسویں روایت**

ابن عباس کا بیان ہے کہ مثل نورہٖ کمشکٰوۃ میں کاتب سے غلطی ہوئی ہے۔ خدا کی شان اس سے بلند ہے کہ اس کے نور کی مثال مشکٰوۃ ہو بلکہ اصل یہ آیت اس طرح تھی کہ مثل نور المؤمن کمشکٰوۃ ابن اشتہ نے ان تمام لغزشوں کو نقل کر کے کہا ہے کہ اُن سے مراد وہی تعیین قرارت میں غلطی ہے نہ یہ کہ جو کچھ موجود ہے وہ غلط اور ناقابلِ عمل ہے لیکن افسوس ہے کہ روایات کے الفاظ اس تاویل سے بہت دور ہیں

وُہ فرماتے ہیں کہ قلم میں روشنائی زیادہ آگئی واؤ صاد سے مل گیا جس کی بنا پر ووصّٰی کا وقضیٰ ہوگیا۔ یہ فرماتے ہیں کہ یعنی تعیین قرارت میں غلطی ہُوئی وُہ فرماتے ہیں کہ حروفِ آیت میں تحریف ہُوئی، ان کا ارشاد ہے یعنی تعیین قرارت میں غلطی ہُوئی۔ وُہ کہتے ہیں کہ وقضیٰ ربّك غلط ہے اس لیے کہ قضائے کے بعد تخلف کیسا؟ یہ کہتے ہیں یعنی وُہ بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے لیکن مقامِ تعیین میں اس کا انتخاب کرنا غلطی تھی۔

کیا تاویلات ایسے ہی ہونا چاہئیں جن سے الفاظ بہت شدت سے انکار رکھتے ہوں۔

ابن انباری نے ان روایات کے خلاف قدح کا حربہ تیز کیا ہے اور سب کا جواب یہی دیا ہے کہ وُہ ضعیف السند ہیں لہذا قابلِ اعتبار نہیں مگر یہ ایسا جواب ہے کہ حافظ سیوطی بھی اُس سے راضی نہیں اور وُہ ان دونوں جوابوں کے نقل کے بعد فرماتے ہیں والجواب الاوّل اولیٰ واقعد "پہلا جواب بہتر اور زیادہ دلنشیں ہے"۔

لیکن ہم نے پہلے جواب کی حقیقت واضح کردی۔ اب رہی تضعیف وُہ اس کثرتِ اسناد اور تعدد روایات کی بنا پر جو استفاضہ کی حد سے بڑھ گئی ہے اعتبار کی مستحق نہیں ہے۔

## قرآن میں تغییر و تبدیل اور بالفاظِ دیگر تحریف

قال ابو عبید حدثنا حجاج عن ابن جریج اخبرنی ابن ابی حمید عن حمیدۃ بنت ابی یونس قالت قرأ علیّ ابی وھو ابن ثمانین سنۃ فی مصحف عائشۃ ان اللّٰہ وملائکتہ یصلون علی النبی یایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما وعلی الذین یصلون الصفوف الاوّل قالت قبل ان یغیر عثمان المصاحف۔

حمیدہ بنت ابی یونس کا بیان ہے کہ میرے سامنے ابی بن کعب نے جب کہ وُہ کبیر السن اسی برس کی عمر کے تھے مصحفِ عائشہ میں یہ آیت اس طرح پڑھی تھی کہ ان اللّٰہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی یایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما وعلی الذین یصلون الصفوف الاوّل۔ کہا یہ اس وقت کا ذکر ہے کہ جب تک حضرت عثمان نے مصاحف میں تغییر و تبدیل نہیں کی تھی۔ (اتقان سیوطی ج ۲ ص۲۵)




روایت سے صاف ظاہر ہے کہ وعلی الذین یصلون الصفوف الاوّل کا فقرہ جنابِ عائشہ کے مصحف میں موجود تھا اور حضرت عثمان نے مصاحف میں تغییر و تبدیل فرمائی تھی۔ اس کے ساتھ تحریف و تغییر کی نوعیت بتلائی نہیں گئی اور یہ کہ اس کا اثر احکامِ الٰہیہ پر پڑا تھا یا نہیں؟

بے شک علامہ سیوطی نے اس خبر کو نسخِ تلاوت کے ذیل میں درج کیا ہے لیکن یہ ایک خیال ہے جس کا وزن خلافاً اجتہادی سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر آیت منسوخ التلاوۃ ہوتی تو حضرت عائشہ اُس کو اپنے مصحف میں کیوں باقی رہنے دیتیں حالانکہ اُن معظمہ کا ساتھ جناب رسالتمآبؐ سے آخری وقت تک رہا تھا لہذا عرضۂ اخیرہ کی خبر اُن سے بڑھ کر کس کو ہو سکتی تھی؟ اور ابی بن کعب اس کو کیوں تلاوت کرتے جبکہ وُہ اقرأ الصحابہ اور بنصِ حضرت عمر سید القراء تھے اور پھر حضرت عثمان کی طرف اس تغییر کی نسبت سے صاف ظاہر ہے کہ وُہ زید بن ثابت کے پہلے مرتبہ جمع قرآن کرنے میں موجود تھی اور نیز اس لیے کہ اگر زید والے قرآن میں نہ ہوتی تو حضرت عائشہ کا مصحف اُس پر مشتمل نہ ہوتا کیونکہ مصحف حضرت عائشہ اُس جمع قرآن کے موقع پر موجود نہ تھا ورنہ حضرات شیخین کو اس کاوش کی ضرورت نہ پڑتی اور نہ قرّاء کے قتل ہونے سے اُس کے تلف کا خوف پیدا ہوتا بلکہ یقیناً یہ مصحف اُس کے بعد لکھا گیا ہے اور چونکہ وُہ صحف حضرت ابوبکر ہی کے پاس موجود تھے اور وہی اُن کے جمع و تدوین کے بانی تھے اور حضرت عائشہ کے کتابتِ مصحف کے وقت کسی خاص جمع و تدوین کا پتہ بھی نہیں ہے اس بنا پر یقیناً حضرت عائشہ کا مصحف انہی صحف کی مطابقت سے تھا۔ پھر اگر وُہ منسوخ التلاوۃ تھی تو عرضۂ اخیرہ میں حاضر ہونے والے زید بن ثابت ہی اُس کو قرآن میں درج کیوں کرتے جو نوبت حضرت عثمان تک پہنچتی اور انھیں اس تغییر و تبدیل کی ضرورت محسوس ہوتی۔

## قرآن کا کثیر حصہ تلف

حدثنا ابن ابی مریم عن ابن لھیعۃ عن ابی الاسود عن عروۃ بن الزبیر عن عائشۃ قالت کانت سورۃ الاحزاب تقرأ فی زمن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم مأتی ایۃ فلما کتب عثمان المصاحف لم یقدر منھا الا ما ھو الاٰن۔

عروہ بن زبیر حضرت عائشہ کی زبانی ناقل ہیں کہ آپ فرماتی تھیں سورۂ احزاب جناب

رسالت مآبؐ کے زمانہ میں دو سو آیتوں کا پڑھا جاتا تھا لیکن جب حضرت عثمان نے مصاحف کو لکھا تو انھیں نہ مل سکا مگر اتنا ہی کہ جواب موجود ہے۔ (اتقان۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۵)

اس روایت کے الفاظ کو بھی نسخ تلاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے کہ حضرت عائشہ بقیہ حصّہ کے عدمِ اندراج کی وجہ عجز و قصور اور دستیاب نہ ہو سکنے کو قرار دیتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافی جستجو کی گئی کہ اگر کچھ اور آیات اس سُورہ کے متعلق دستیاب ہوں تو وُہ درج کئے جائیں لیکن اس سے زیادہ نہ مل سکے۔ اگر اس حصّہ کے متعلق معلوم ہوتا کہ وُہ منسوخ التلاوہ ہے تو زید بن ثابت صاحبِ عرضۂ اخیرہ اس امر پر مطلع ہوتے اور اُن آیات کو ڈھونڈھنے، جستجو کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تاکہ نتیجہ میں یاس و حرمان سے دوچار ہونا پڑے بلکہ وُہ آیات اگر سامنے موجود ہوتے تب بھی درج نہ کئے جاتے لہٰذا درج نہ کئے جانے کا سبب یہ بتلانا کہ وُہ دستیاب نہ ہو سکے اس امر کی صریحی دلیل ہے کہ وُہ آیات منسوخ التلاوۃ نہ تھے بلکہ اگر دستیاب ہوتے تو ضرور درج کرنے کے قابل تھے۔

یہ خیال کہ کسی آیت کا صحابہ کے ذہن سے نکل جانا اور اُن کا اُسے فراموش کر دینا بھی اُس کے منسوخ التلاوۃ ہونے کی سند ہے واقعیت سے کوسوں دُور ہے۔

انسان عجز و قصور کا مجسمہ اور اس کی طبیعت نقائص کا مجموعہ ہے، سہو و نسیان اُس کے فطری عوارض میں سے ہے جو طویل عرصہ تک بے توجہی اور عدمِ مزاولت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اس کی ذمّہ داری خداوندِ عالم پر عائد کرنا غلط ہے۔

صحیح بخاری سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نسیان سے رسالت مآبؐ بھی مستثنیٰ نہ تھے چنانچہ اُس میں "باب نسیان القرآن" میں یہ حدیث موجود ہے حدثنا احمد بن ابی رجاء قال حدثنا ابو اسامۃ عن ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃ قالت سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلا یقرأ فی سورۃ باللیل فی المسجد فقال یرحمہ اللہ لقد اذکرنی کذا وکذا اٰیۃ کنت انسیتھا من سورۃ کذا وکذا۔

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے ایک شخص کو شب کے وقت ایک سورہ پڑھتے سُنا۔ حضرتؐ نے فرمایا خدا اس پر رحمت نازل کرے اُس نے مجھ کو فلاں فلاں آیتیں





فلاں فلاں سورہ کی یاد دلا دیں جن کو مَیں بھُول گیا تھا۔" (صحیح بخاری مطبوعہ کرزن پریس ص۲۵۳)

اور اس مضمون کی متعدد حدیثیں اس باب میں اور باب "من لم یر باسا ان یقول سورۃ البقرۃ وسورۃ کذا" میں مذکور ہیں۔ پھر جب رسالتمآبؐ کا نسیان بعض آیات کو اُن آیات کے منسوخ التلاوۃ ہونے کی دلیل نہ ہو اور رسالتمآبؐ اُن آیات کے یاد آجانے پر اظہارِ مسرت نہ فرماتے تو کسی اور کا نسیان نسخ تلاوت کی دلیل کب ہو سکتا ہے؟

اور پھر تلف کے اسباب سہو و نسیان میں منحصر نہیں بلکہ دُوسری صورتیں بھی تھیں جن میں سب سے اہم حفاظ قرآن کا لڑائیوں میں شہید ہو جانا ہے جس کی بناء پر حضرت عمر کو قرآن مجید کی جمع آوری کا خیال پیدا ہُوا تھا چنانچہ اتقان ج ۱ ص۵۹ میں ہے۔

اخرج ابن ابی داؤد من طریق الحسن ان عمر سأل عن اٰیۃ من کتاب اللہ فقیل کانت مع فلان قتل یوم الیمامۃ فقال انا للہ وامر بجمع القرآن

"حسن کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے ایک آیت کے متعلق دریافت کیا، معلوم ہُوا کہ فلاں صحابی کے پاس تھی جو جنگِ یمامہ میں قتل ہو گئے، یہ سُن کر آپ نے (متاسفانہ) کہا انا للہ وانا الیہ راجعون اور جمع قرآن کا مشورہ دیا۔"

علامہ سیوطی اس روایت کے متعلق فرمائیں کہ منقطع الاسناد ہے لیکن وُہ اس کو کیا کریں گے کہ اس کا مضمون صحیح بخاری کی اُس حدیث سے بالکل موافق ہے جس میں حضرت عمر کا گھبرا کر حضرت ابوبکر کی خدمت میں آکر کہنا مذکور ہے کہ غضب ہوگیا۔ روزِ یمامہ بہت سے حفاظِ قرآن مار ڈالے گئے اور اگر اسی طرح دو تین لڑائیوں میں حفاظ قرآن کام آئے تو کثیر حصّہ قرآن کا ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حفاظِ قرآن کی شہادت سے آپ کو کثیر مقدار میں قرآن مجید کے تلف کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا، کیا اس صورت سے جو اجزائے قرآن تلف ہوں وُہ بھی منسوخ التلاوۃ سمجھے جائیں گے تو پھر حضرت عمر کو فکر ہی کیا تھی؟ جتنے آیات منسوخ ہونے والے تھے وُہ تلف ہو جاتے اور جو کچھ باقی رہتا وُہ ہی مکمل قرآن سمجھا جاتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ درحقیقت اس قسم کے حوادث سے قرآن مجید کی اصلیت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور نہ اُن کو نسخ تلاوۃ سے کوئی تعلق ہے

## دُوسری روایت

قال ابوعبید حدثنا اسمٰعیل بن ابراھیم عن ایوب عن نافع عن ابن عمر قال لیقولن احدکم قد اخذت القرآن کلہ ومایدریہ ماکلہ قد ذھب منہ قرآن کثیر ولکن لیقل قد اخذت ما ظھر۔

"حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ تم میں سے ہر شخص کہتا ہوگا کہ مَیں نے پورا قرآن حاصل کرلیا، حالانکہ اسے کیا معلوم پورا قرآن کیا چیز ہے، اُس میں تو اکثر حصّہ تلف ہوگیا ہے، بے شک یہ کہنا چاہیئے کہ قرآن میں سے جتنا ظاہر ہُوا اس کو مَیں نے لے لیا ہے۔"

(اتقان ج ۲ ص۲۵)

وُہ نسخ تلاوت والا وار جو ہر روایت کے متعلق منیجا ہُوا ہے اگرچہ ہمیشہ خالی جاتا ہے۔ بھلا اس روایت کے مقابل کیونکر نہ ہوتا چنانچہ فوراً ذھب منہ قرآن کثیر کے معنی کہہ دیئے گئے کہ یعنی اکثر حصہ اس کا منسوخ التلاوۃ ہوگیا ہے لیکن معنی شناس افراد اس تاویل کی بیکباری کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

ایک تو منسوخ التلاوۃ ہوجانے کے معنی یہ ہیں کہ وُہ آیت بحکم الٰہی قرآن سے خارج کردی گئی پھر اُس کی بناء پر اس ممانعت کے کوئی معنی نہیں کہ قرآن کامل موجود ہونے کا اپنے پاس ادعا نہ کرو، حضرت عبداللہ بن عمر ایسے فقیہ کی طرف اس بے بنیاد حکم کی نسبت قابلِ تسلیم نہیں ہے۔

پھر اس کے مقابلہ میں یہ کہنے کی ہدایت کہ قد اخذت منہ ما ظھر نسخ تلاوت پر منطبق نہیں ہے اس لیے کہ ظہور مقابل خفا ہے اور خفاء وجود پر موقوف یعنی اکثر حصہ قرآن کا مخفی رہا اور ہم تک نہ پہنچ سکا جو کچھ پہنچا وُہ ہم نے لے لیا، نسخ بمعنی ازالہ ہے اور اُس کا مقابل بقاء ہے نہ ظہور۔ بے شک یہ کہنا اُس صُورت میں صحیح تھا کہ قد اخذت منہ ما بقی۔

پھر ذہاب کے معنی کو نسخ تلاوت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ذہاب کی لفظ وہی ہے جو حدیث جمع قرآن میں حضرت عمر کی زبانی باین الفاظ مذکور ہے۔

انی اخشٰی ان یستحر القتل بالقرآء فی المواطن فیذھب کثیر من القرآن۔

"مجھ کو خوف ہے کہ لڑائیوں میں حفاظ اسی صُورت پر مار ڈالے جائیں تو بہت سا قرآن ہاتھ





سے جاتا رہے۔"

یہاں ذہاب کے معنی تلف کے سوا کچھ اور نہیں اور یہ لفظ اسی عبارت کے ساتھ عبداللہ بن عمر کے قول میں مذکور ہے وُہ فرماتے ہیں قد ذھب منہ قرآن کثیر لہذا اس کے بھی معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ بہت سا قرآن ہاتھ سے جاتا رہا یعنی تلف ہوگیا ہے۔

## مذکورہٌ بالا تصریحات کے نتائج

مذکورہٌ بالا تمام بیانات سے حسبِ ذیل نتیجہ برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید رسالت مآبؐ کے زمانہ میں جمع نہ ہوا تھا بلکہ وُہ متفرق کاغذ کے پُرزوں، پتھر کے ٹکڑوں اور اسی قسم کی چیزوں پر درج تھا۔

(۲) رسالت مآبؐ کی وفات کے بعد جبکہ ایک کثیر تعداد حفاظِ قرآن میں کی قتل ہوچکی اُس وقت جمع قرآن کا خیال پیدا ہُوا۔

(۳) جمع و ترتیب کا کام ذاتی اعتماد کی بنا پر انفرادی حیثیت سے زید بن ثابت کے سپرد کردیا گیا اور اس طرح اُس کی تمام ذمہ داری صرف زید کی طرف عائد قرار پائی ہے۔

(۴) زید بن ثابت دو گواہوں کی تصدیق کے بعد آیت کو درج کرتے تھے اس سے ان آیات کے تواتر کو صدمہ پہنچتا ہے اور نیز وُہ آیات درج ہونے سے رہ گئے جن پر شہادتِ عدلین حاصل نہ تھی لہذا اس مجموعہ کے مکمل ہونے کا یقین کیونکر ہو؟

(۵) قرآن کا نظم و نسق اصل ترتیبِ قرآن سے بالکل مخالف ہے۔ سُوروں میں آگے کا پیچھے اور پیچھے کا آگے اور نیز آیات میں مقدم کا مؤخر اور مؤخر کا مقدم ہوگیا ہے۔

(۶) قرآن مجید سات حرفوں پر نازل کیا گیا تھا جن کے اعتبار سے صحابہ کی قرارت میں بھی اختلاف تھا لیکن حضرت عثمان نے چھ حرفوں کو ساقط کرکے تمام صحابہ کو ایک ہی قسم کی قرات کا پابند بنا دیا۔

(۷) موجودہ قرآن میں بتصریح حضرت عائشہ و ابن عباس وغیرہ کتابت کی غلطیاں پائی جاتی تھیں جن کی اصلاح نہ ہوسکی اور وُہ اسی غلط صُورت پر حدِ تواتر کو پہنچ گیا۔

(۸) مصاحفِ قرآنیہ میں تغیر و تبدیل ہوگئی تھی جن کے مقامات کا علم بھی نہیں ہے۔

(۹) قرآن سے کثیر حصّہ ساقط ہوگیا ہے اور مکمل قرآن موجود نہیں ہے ۔

اب ان نتائج کے مطابق جن میں سے ایک حرف بھی میرا طبعزاد نہیں ہے اور نہ یہ ضروری ہی ہے کہ میں اُن تمام سے متفق ہوں بلکہ وُہ تمام اُن احادیث و روایات کا لب لباب ہے جو مستند جوامع حدیث وکتب برادران اہل سنّت میں مذکور ہیں کیا ایمان بالقرآن کا دعوٰے عقل و منطق کی رُو سے حق بجانب ہے ؟

معیار اعتبار پر ایک عمیق نظر ڈالو اور اُن روایات کو اُس پر منطبق کرو!

پہلا جزو یہ کہ "کسی جزو میں بھی تحریف و تغییر کا یقین کے ساتھ احتمال بھی نہ ہو" ان روایات سے رخصت ہوگیا جن میں صاف طور پر اس قرآن میں تغییر و تبدیل اور اغلاط کتابت اور حذف و اسقاط کا اعتراف کیا گیا ہے ۔

دُوسرا جزو یہ تھا کہ "اگر تحریف و تغییر کا وجود ثابت ہو تو مستند وجوہ کی بنا پر ان مقامات کی تعیین ہو جہاں وُہ تغییر ہُوا ہے یا ان مطالب کی نوعیت معلوم ہو کہ جن کا اسقاط عمل میں آیا ہے اور باقی کے متعلق کوئی قطعی ضمانت ہو جو اُس کے کلام الٰہی اور واجب العمل ہونے کی دلیل ہو" لیکن یہاں ایسا بھی نہیں ، حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ کثیر حصّہ قرآن کا ہاتھ سے جاتا رہا لیکن یہ نہ معلوم ہُوا کہ وُہ کثیر حصّہ آیاتِ قصص و مواعظ وغیرہ میں کا تھا یا آیات احکام ؟

اور اس کے ساقط ہو جانے سے موجودہ آیات کے معانی و مطالب پر کچھ اثر پڑا یا نہیں اس لیے کہ اکثر ایک آیت کے معنی میں دُوسرے آیات کے ضمیمہ سے عظیم انقلاب پیدا ہو جایا کرتا ہے ۔

اسی طرح حضرت اُم المؤمنین عائشہ نے یہ فرمادیا کہ سورۂ احزاب دو سو آیتوں سے زیادہ تھا مگر اُن آیات کی نوعیت کچھ نہ بتلائی ۔ اس تحریف و تغییر اور حذف و اسقاط کی اجمالی اطلاع سے کیا ہر ہر جزو مشکوک نہ ہوگا اور پھر جب کہ موجودہ باقی حصّہ کی صحت کے لیے کوئی قطعی دلیل بھی تسلیم شدہ عقائد کی بنا پر موجود نہیں ہے اس لیے کہ فرزندان اسلام کی اکثریت نے رسُول کے بعد کسی معصوم شخص کے وجود کو ضروری نہیں سمجھا ہے جو اسلام و آثار اسلام کا حقیقی





محافظ ہو بلکہ وُہ تمام اشخاص کو جائز الخطا سمجھتے ہیں اور جائز الخطا اشخاص کا نتیجۂ عمل قطعی طور پر خطا کے احتمال سے بلند نہیں ہو سکتا لہٰذا اب برہانی حیثیت سے ایمان بالقرآن کا مستند کیا رہ جاتا ہے ؟ کچھ نہیں !

لیکن باوجود اس کے میں اس امر کا حق نہیں رکھتا کہ کسی کے ایمان بالقرآن کی نفی کروں اور نہ جیسا کہ تمہید میں کہہ چکا ہوں میں نے اس مقصد کے لیے قلم اٹھایا ہے ۔

ہمارے سوادِ اعظم کے پاس ایک بنیاد موجود ہے جس پر وُہ ایمان بالقرآن کی عمارت قائم کر سکتے ہیں اور وہ حسنِ ظن صحابۂ کرام کے ساتھ ہے ، یہ وُہ مضبوط اساس ہے جس پر خلافت ایسے اہم مسئلہ کی بنیاد قرار پائی ہے چنانچہ عضد الدین ایجی نے کتاب مواقف میں حضرت علیؑ کی افضلیت کے ادلّہ نقل کرنے کے بعد بسلسلۂ جواب حسب ذیل عبارت تحریر فرمائی ہے ۔

نحن وجدنا السلف قالوا ان الافضل ابوبکر ثم عمر ثم عثمان ثم علی وحسن الظن بهم یقتضی ان لو یعرفوا لم یطبقوا علیه فوجب علینا اتباعهم فی ذٰلك القول وتفویض ما هو الحق الی الله۔

"ہم نے صدرِ اسلام کے لوگوں کو یہ کہتے ہُوئے پایا کہ افضلیت بترتیبِ خلافت ہے اور حسنِ ظن ان لوگوں کے ساتھ اس امر کا مقتضی ہے کہ اگر وُہ اس امر کو پورے طور پر سمجھ نہ لیتے تو کبھی اس پر متفق نہ ہوتے لہٰذا ہم پر اس قول میں اُن کا اتباع لازم ہے اور واقعاً حق کیا ہے اُس کو خدا کے سپُرد کرتے ہیں"

شارحِ مواقف نے بھی اس قول میں اُن سے اختلاف نہیں کیا ہے ۔

(ملاحظہ ہو شرح مواقف مطبوعہ لکھنؤ ص۷۴۳ ۔ ۷۴۴)

اب جتنی بھی عقلی و نقلی دلیلیں پیش کی جائیں اُن سب کے مقابلہ میں حسنِ ظن صحابہ کے ساتھ کافی ہے اور وہی ایمان بالقرآن کا واحد مستند ہو سکتا ہے اور بس ۔

# قرآنِ مجید کے متعلق شیعی نقطۂ نظر

اس میں شبہ نہیں کہ جوامع حدیث میں ایسے روایات موجود ہیں جن سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید اصلی صورت پر باقی نہیں ہے بلکہ اُس میں کچھ نہ کچھ تغیر و تبدل پیدا ہُوا ہے لیکن اس کی نوعیت کیا ہے اس میں یہ احادیث سب ایک ہی نقطہ پر مجتمع نہیں ہیں بلکہ اُن کے مفاد میں اختلاف ہے اور اس طرح یہ روایات چند اقسام کے تحت میں مندرج ہو جاتے ہیں۔ جن کو فہرست وار درج کرتے ہُوئے کہیں کہیں علم رجال کے معیار پر سند کی تحقیق بھی کرتے جائیں گے۔

**پہلی قسم** | وُہ روایات جن سے صرف اختلافِ ترتیب کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن ترتیبِ نزول کے مطابق نہیں ہے۔

(۱) عن احمد بن علی القرشی عن محمد بن الفضیل عن ابی حمزۃ الثمالی عن ابی جعفر علیہ السّلام قال ما احد من ھٰذہ الامۃ جمع القرآن کما انزل بہ جبرئیل علیہ السّلام علی محمّد الاوصی محمّد صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم

ابو حمزہ ثمالی نے امام محمد باقرؑ سے نقل کیا ہے کہ حضرت نے فرمایا کسی شخص نے اس امت میں سے قرآن کو اُس طرح جمع نہیں کیا کہ جس طرح اُس کو جبرئیل نے رسالت مآبؐ پر نازل کیا تھا مگر وصی رسُول (علیؑ) نے۔

(۲) محمّد بن یحییٰ عن احمد بن محمّد عن ابن محبوب عن عمرو بن ابی المقدام عن جابر قال سمعت ابا جعفر علیہ السّلام یقول ما ادعی احد من الناس انہ جمع القرآن کلہ کما انزل الا کذاب وما جمعہ وحفظہ کما نزلہ اللّٰہ الا علی بن ابی طالب والائمۃ من بعدہٖ۔

امام محمد باقر علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ کوئی شخص عام لوگوں میں سے اس بات کا ادعا نہ کرے گا کہ اُس نے قرآن کو جس طرح خدا نے نازل کیا تھا اس صورت پر حفظ کیا ہے مگر یہ کہ وُہ دروغ گو





ہوگا۔ اُس کو اُس صورت پر نہیں حفظ کیا مگر علی بن ابی طالبؑ نے اور ائمہ نے کہ جو آپ کے بعد تھے۔

اس روایت کو ثقۃ الاسلام ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی نے اصُول کافی میں اور محمد بن حسن صفار نے بصائر الدرجات میں درج کیا ہے۔ ان دونوں حدیثوں کے مفاد پر نظر کی جائے تو وُہ اتقان سیوطی والی اُس روایت سے بالکل مطابق ہے جس میں عکرمہ سے دریافت کیا گیا ہے کہ الفوہ کما انزل الاول فالاول "کیا صحابہ نے قرآن کو جس طرح خدا نے نازل کیا تھا اُسی صُورت پر سلسلہ وار جمع کیا تھا"۔ اور عکرمہ نے کہا ہے کہ لو اجتمعت الانس والجن علی ان یولفوہ ھٰذا التالیف ما استطاعوا۔

"اس صورت سے تو اگر تمام جن و انس بھی جمع ہوتے قرآن مجید کو جمع نہ کر سکتے تھے"۔

بے شک اس مقولہ کی تعمیمی حیثیت میں جس تنگ نظری و کوتاہ بینی کا مظاہرہ موجود تھا اُس کی ان دونوں روایتوں میں استثنائی جملہ سے اصلاح کر دی گئی ہے۔

اِن دونوں روایتوں سے ظاہر ہے کہ امیر المومنینؑ کے ترتیب دادہ قرآن میں یہ امر مخصوص تھا کہ وُہ کیفیت ترتیب میں عنوانِ نزول کے مطابق تھا اور اسی کے موافق علمائے اہلِ سنت کے روایات سابق میں ذکر ہو چکے ہیں۔

دُوسری خصُوصیت وُہ ہے جس کا تذکرہ احتجاج طبرسی کی ایک طویل روایت کے ذیل میں ہُوا ہے کہ فلما رأی علی علیہ السّلام غدرھم وقلۃ وفائھم لزم بیتہ و اقبل علی القرآن یولفہ و یجمعہ فلم یخرج حتی جمعہ کلہ فکتبہ علی تنزیلہ والناسخ والمنسوخ۔

"جب امیر المومنینؑ نے لوگوں کی بے اعتنائی کا مشاہدہ کیا تو اپنے گھر میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی اور قرآن مجید کی جمع و تالیف میں مشغول ہو گئے اور اُس وقت تک گھر سے باہر تشریف نہ لائے جب تک کہ اُس کو پورا جمع نہ کر لیا اور اُس کو ترتیب نزول کے مطابق ناسخ و منسوخ کے ساتھ تحریر کیا"۔

اسی کے مطابق محمد بن سیرین کی روایت تاریخ الخلفاء سیوطی میں بھی موجود ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے ترتیب نزول کے مطابق مرتب ہونا قرآن کا خود ایک حد تک ناسخ و منسوخ کی تعیین کا ذمہ دار ہے اس لیے کہ مقدم کا مؤخر اور مؤخر کا مقدم ہو جانے کی صورت میں یقیناً اگر خارجی روایات سے معلوم نہ ہو تو ناسخ و منسوخ میں اشتباہ ہو جانا ناگزیر ہے مثلاً یہی کہ جب انسان قرآن میں تعیین عدۂ وفات کی آیت واربعۃ اشہر وعشرا کو پہلے اور ومتاعا الی الحول والی آیت کو بعد دیکھ رہا ہے تو کیوں نہ سمجھے گا کہ ایک سال مقرر کرنے والی آیت ناسخ اور چار مہینہ دس دن کی آیت منسوخ ہے لیکن اس کے ساتھ ممکن ہے کہ جناب امیرؑ کے قرآن میں تفسیری حواشی کے طور پر ناسخ و منسوخ کی تعیین بھی کر دی گئی ہو اور اسی لیے محمد بن سیرین نے کہا ہے کہ لو اصیب ذٰلک الکتاب کان فیہ العلم۔ اگر وہ قرآن لوگوں کے ہاتھ میں پڑ جاتا تو ایک بڑا علمی ذخیرہ دستیاب ہوتا۔

(تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۸۴)

**دُوسری قسم** وہ احادیث جن سے قرآن موجود میں اجمالی طور پر کمی پائے جانے کا پتہ چلتا ہے مثلاً عن علی بن الحکم عن ہشام بن سالم قال سألت ابا عبد اللہ علیہ السلام عن سورۃ الاحزاب فقال کانت مثل سورۃ البقرۃ مثلہا و مثل ثلثیہا۔

ہشام بن سالم نے امام جعفر صادقؑ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ سورۂ احزاب بقرہ کا اتنا اور اتنا نہیں تو اُس کے دو ثلث کے برابر تھا۔

(۲) عن القسم بن الایادی عنہ صلوات اللہ علیہ قالت سورۃ الاحزاب سبعمائۃ ایۃ۔

ارشاد ہوا ہے کہ سورۂ احزاب میں سات سو آیتیں تھیں۔

(۳) عن سماعۃ عن ابی بصیر قال قلت لابی جعفر علیہ السلام ان الناس یقولون قد ذھب من سورۃ الاحزاب شیٔ کثیر قال سبحان اللہ ما ذھب فغیہ قلت این ھو قال ھو واللہ عندنا۔

ابوبصیر کا بیان ہے کہ میں نے امام محمد باقرؑ کی خدمت میں عرض کی لوگ کہتے ہیں کہ





سورۂ احزاب میں سے کثیر حصہ تلف ہو گیا۔ آپ نے فرمایا جو کچھ تلف شدہ کہا جاتا ہے وُہ موجود ہے۔ میں نے کہا کہاں؟ فرمایا ہمارے پاس۔ ان روایات کے بالکل مطابق حضرت ام المؤمنین عائشہ کا بیان اتقان سیوطی سے سابق میں درج ہو چکا ہے اور اُس کے متعلق کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے لیکن احمد بن محمد سیاری جن کی کتاب ان احادیث کا ماخذ ہے اُن کے متعلق شیخ الطائفہ نے فہرست میں لکھا ہے ضعیف الحدیث فاسد المذہب مجفو الروایۃ کثیر المراسیل اور علامہ نے فرمایا ہے کثیر المراسیل اور نجاشی نے بھی کہا ہے فاسد المذہب اور کشی کی روایت ہے کہ امام محمد تقیؑ نے اس شخص پر اظہار بے اعتمادی کیا تھا۔ فاسد المذہب کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص مذہبی حیثیت سے فرقۂ شیعہ سے تعلق نہ رکھتا تھا اس لئے اس کے روایات کی ذمہ داری ہم پر عائد کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

(۴) عن محمد بن یحیٰی عن احمد بن محمد عن علی بن الحکم عن ہشام بن سالم عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال ان القراٰن الذی جاء بہ جبرئیل الی محمد صلی اللہ علیہ و الہ سبعۃ عشر الف ایۃ۔

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ وُہ قرآن جو جناب رسالت مآبؐ پر نازل ہُوا تھا اُس میں سترہ ہزار آیتیں تھیں، اس روایت کو بے شک کلینیؒ نے کافی میں درج کیا ہے لیکن سلسلۂ سند ذکر کر کے ذمہ داری کو اپنے اوپر سے ہٹا دیا ہے اور باخبر مطالعہ کرنے والے کے لیے تحقیق رجال کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔

اس روایت کا استناد بھی احمد بن محمد سیاری کی جانب ہے جن کے متعلق اس کے قبل روشنی ڈال جا چکی ہے اور پھر خود سیاری کی کتاب میں محدث نوری کے بیان کے مطابق عشرۃ الف آیۃ یعنے دس ہزار آیتوں کا ذکر ہے اور کافی کے بعض نسخ میں سبعۃ آلاف یعنی صرف سات ہزار آیتیں ہیں اور ملا محسن فیض کاشانی نے وافی میں جو اس حدیث کو اصول کافی سے نقل کیا ہے تو اُس میں یہ لفظ سبعۃ الاف ہی درج ہے اس اختلاف نسخ اور اضطراب متن کے باوجود کہاں وثوق ہو سکتا ہے کہ امام علیہ السلام نے کیا تعداد بتلائی تھی۔

اور پھر روایت سے صریحی طور پر نقص ثابت بھی نہیں ہوتا اس لیے کہ آیات کی تحدید

فواصل کے اعتبار سے مقرر کی گئی ہے اور وسط آیات میں اکثر مقامات پر وقف لازم اور وقف جائز وغیرہ کے علامات مختلف صورتوں میں پائے جاتے ہیں جو قراء کے اختلافات کا نتیجہ ہیں اور جن میں قراء سب ایک نقطہ پر مجتمع بھی نہیں ہیں تو کیا نہیں ممکن کہ فواصل کی شناخت اور ابتداء و اختتام کی تعیین میں فروگذاشت ہوئی ہو اور اس لحاظ سے آیات کی تعداد میں اختلاف پیدا ہو جائے اور یہی اس روایت کا مفاد ہو۔

**تیسری قسم** وُہ روایات جن سے خاص خاص آیات میں بعض مخصوص الفاظ کی تغیر و تبدیل اور کمی کا پتہ چلتا ہے جنھیں محدث نوری نے فصل الخطاب میں سلسلہ وار درج کیا ہے اور اُن میں سے اکثر اگرچہ سیاری کے روایات ہیں جو اُنھوں نے اپنی کتاب القراءات میں جس کا دوسرا نام "التنزیل والتحریف" ہے درج کیے ہیں اور در حقیقت محدث نوری کو فصل الخطاب لکھنے کا زیادہ شوق اسی کتاب کو دیکھ کر پیدا ہُوا تھا اس لیے کہ اس کتاب کا موضوع ہی شروع سے آخر تک یہی ہے اور سیاری کے درجہ اعتبار کی حقیقت اس کے قبل کُھل چکی ہے لیکن ان روایات میں ایسے بھی احادیث ہیں کہ جو دیگر جوامع حدیث میں مختلف طرق و اسانید سے مذکور ہیں۔

ان روایات میں اکثر ایسے اختلافات کا پتہ ہے جو صرف الفاظ کے طریق استعمال سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے معنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اُن کی اہمیت اُس اختلاف سے زیادہ نہیں ہے کہ جو قراء سبعہ کی ساتوں مشہور قراءتوں میں عام کتب تفسیر و قراءت میں مذکور ہے مثلاً

صراط الذین انعمت علیھم کے بجائے صراط من انعمت علیھم ولا الضالین کے بجائے وغیر الضالین۔ اھدنا الصراط المستقیم کے بجائے اھدنا السراط المستقیم مالک یوم الدین کے بجائے ملک یوم الدین۔ اور بعض روایات وہ ہیں کہ جن میں مختلف آیاتِ قرآن میں بعض الفاظ کے کم ہونے کا پتہ دیا گیا ہے جیسے۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا (فی علی) فاتوا بسورۃ من مثلہ۔ فبدل الذین ظلموا (آل محمد حقھم) قولاً غیر الذی قیل لھم فانزلنا علی الذین ظلموا (آل محمد حقھم) رجزاً۔ بئسما اشتروا بہ انفسھم ان یکفروا بما انزل اللہ (فی علی) بغیاً۔





واذا قیل لھم اٰمنوا بما انزل اللہ (فی علی) قالوا نؤمن بما انزل علینا وغیرہ۔ ان روایات کے متعلق اکثر محققین کا یہ خیال ہے کہ اس قسم کے الفاظ تفسیر و تاویل کے طور پر تھے جو بیان مراد کے لیے جبرئیل امین کے توسط سے جناب رسالتمآب تک پہنچائے جاتے تھے اور رسالتمآب کی طرف سے اگرچہ موقع بموقع اُن کے مفاد کا اظہار ہو جایا کرتا تھا لیکن تعلیم قرآن میں عام طور پر صحابہ کو اُن تفاسیر کے بتلانے کی ضرورت نہ تھی اور وُہ حضرتؐ کے پاس یا حضرتؐ کے بعد اُن کے وارث علم کے پاس محفوظ تھے امیر المومنینؑ نے جو قرآن جمع کیا تھا وہ ان تاویلات کو بھی اپنے اندر لیے ہُوئے تھا جو تفسیری حواشی کے طور پر درج کیے گئے تھے اور اس کی تصدیق اس روایت سے ہوتی ہے جو احتجاج طبرسی میں حضرت امیر المومنینؑ کی زبانی ایک زندیق کے جواب میں وارد ہُوئی ہے اس میں حضرت نے فرمایا ہے ولقد جئتھم بالکتاب کملا مشتملا علی التاویل و التنزیل والمحکم والمتشابہ والناسخ والمنسوخ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وُہ قرآن صرف متنِ قرآن پر مشتمل نہ تھا بلکہ اس میں تاویل و تنزیل اور محکم و متشابہ اور ناسخ و منسوخ سب کا بیان مندرج تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے تنزیل سے کبھی مراد متون الفاظ قرآن نہیں ہیں بلکہ تنزیل سے مُراد قرآن کا اصلی مورد نزول ہوا کرتا ہے یعنی وُہ معنی جس کے ظاہر کرنے کے لیے خاص طور پر وُہ آیت نازل ہُوئی ہے اور تاویل اُس کے لوازم اور وُہ موارد ہیں جن پر تعمیمی حیثیت سے اُس آیت کا انطباق ہے یا باطنی طور پر اُن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کے ثبوت میں میرے پیشِ نظر اصُول کافی کی حدیث طویل ہے جو باب فیہ نکت ونتف من التنزیل فی الولایۃ میں درج ہے جس میں سائل نے مختلف آیاتِ قرآن کے معانی دریافت کیے ہیں اور اکثر معانی کے بتلانے پر سائل نے دریافت کیا ہے کہ یہ تنزیل ہے یا تاویل اور حضرت نے کہیں فرمایا ہے تنزیل ہے اور کہیں تاویل۔ محمد بن الفضیل عن ابی الحسن الماضی قال سالتہ عن قول اللہ عزوجل یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم قال یریدون لیطفئوا ولایۃ امیر المؤمنین بافواھھم قلت واللہ متم نورہ قال واللہ متم الامامۃ لقولہ عزوجل الذین اٰمنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا فالنور ھو الامام قلت ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق قال ھو الذی امر رسولہ بالولایۃ لوصیہ والولایۃ ھی دین الحق قلت لیظھرہ علی الدین کلہ قال یظھرہ علی جمیع الادیان عند قیام القائم ولو کرہ الکافرون بولایۃ علی قلت ھذا

تنزیل قال نعم اما ھذا الحرف فتنزیل واما غیرہ فتاویل۔

محمد بن فضیل نے امام رضاؑ سے سوال کیا کہ اس آیت کے کیا معنی ہیں۔ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم حضرت نے فرمایا یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ولایت امیرالمومنینؑ کو محو کر دیں واللہ متم نورہ یعنی خدا امامت کے مسئلہ کو پورا کرنے والا ہے ھو الذی ارسل رسولہ بالھدٰی ودین الحق یعنی خدا نے اپنے رسُول کو مامور کیا تبلیغ ولایت پر اور ولایت ہی دین حق ہے لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ یعنی قیام حضرت حجّت کے وقت وُہ تمام ادیان پر غالب آجائے گا اور خداوندِ عالم نے یہ فرمایا ہے کہ خدا ولایت حضرت حجت کو تمام کرے گا اگرچہ ولایت علیؑ کے منکر اس کو پسند نہ کریں۔

سائل نے پوچھا کہ یہ جو آپ نے فرمایا تنزیل ہے؟ یعنی اصل مورد نزول آیت ہے حضرت نے فرمایا ہاں جو میں نے کہا وُہ تو تنزیل ہے۔

اور اس کے علاوہ جو دُوسری چیزیں ہوں وُہ تاویل میں داخل ہیں۔ پھر لما سمعنا الھدٰی اٰمنا کے متعلق ارشاد ہوا الھدی الولایۃ اٰمنا بمولانا فمن اٰمن بولایۃ مولاہ فلا یخاف بخسا ولا رھقا۔ "ہدیٰ سے مُراد ولایت ہے تو جو شخص اپنے مولا کی ولایت پر ایمان لایا اُس کو کچھ خوف نہ کرنا چاہیئے" سائل نے پوچھا تنزیل؟ "یہ تنزیل ہے؟" فرمایا لا تاویل "نہیں یہ تاویل ہے اور اسی صورت پر حضرت نے بعض معانی کو تنزیل فرمایا ہے اور بعض کو تاویل یہاں تک کہ سب کے آخر میں جو بہت صریح ہے وُہ یہ ہے کہ سائل نے پوچھا ھذا الذی کنتم بہٖ تکذبون کے کیا معنی ہیں؟ حضرت نے فرمایا یعنی امیر المومنین اس سے مراد امیرالمؤمنین ہیں۔ سائل نے پوچھا تنزیل؟ "یہ تنزیل ہے؟ حضرت نے فرمایا "ہاں"

"یعنی امیرالمومنین" کی لفظ کے صاف یہ معنی ہیں کہ امیرالمؤمنین کی لفظ جزو آیت نہیں ہے بلکہ ھذا الذی کی لفظ سے مراد و مقصود ہے اس پر سائل کا یہ پوچھنا کہ یہ تنزیل ہے یا تاویل اور حضرت کا فرمانا تنزیل ہے اس کی صاف دلیل ہے کہ تنزیل بھی معانی کے قبیل سے ہے نہ الفاظ سے۔




اور یہ بھی ممکن ہے کہ تنزیل سے مُراد وُہ تفسیر ہو جو خداوند عالم کی جانب سے الفاظ قرآن کے ساتھ نازل ہوئی تھی اور تاویل وُہ تفسیر ہے جو غیر نازل شدہ ہے لیکن الفاظ کی مراد اصلی ہے اور اس صورت میں یہ حدیث اس دعوٰی کا صریحی شاہد ہو گا کہ قرآن مجید کے ساتھ بعض الفاظ شرح کے طور پر بھی نازل ہُوئے تھے کہ جو حقیقتاً متن قرآن کا جزو نہیں لیکن منزل من اللہ ضرور تھے۔

اور جب تنزیل بھی تفسیر کے قبیل سے ہو گئی تو اب ان روایات کے بھی معنی دُوسری صورت پر ظاہر ہوں گے جن میں یہ ہے کہ امیرالمومنینؑ نے قرآن کو اُس کی تنزیل پر جمع کیا جیسے سلمان کی روایت جس کو کتاب سلیم بن قیس ہلالی اور احتجاج طبرسی میں نقل کیا گیا ہے اور اُس میں یہ ہے کہ فکتبہٗ علی تنزیلہ والناسخ والمنسوخ۔ اس کے بھی معنی یہ ہیں کہ حضرت نے قرآن کو اُس تفسیر کے مطابق تحریر کیا جو حضرت اقدس الٰہی کی جانب سے الفاظ کے لیے بتوسط جبرئیل پہنچائی گئی تھی۔

اور احتجاج کی سابق روایت سے یہ معلوم ہُوا کہ اس میں تنزیل کے ساتھ تاویل بھی مذکور تھی اور در حقیقت اگر خود اُن الفاظ کی نوعیت پر نظر کی جائے جن کا اضافہ روایاتِ مذکورہ میں آیاتِ قرآن کے ساتھ کیا گیا ہے اور آیات کے موجودہ الفاظ کے ساتھ اُن کے جوڑ کا لحاظ کیا جائے تو کچھ نوعیت بھی اُن الفاظ کی تفسیر ہی کی سی نظر آتی ہے اور ذوق وسلیقہ کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وُہ جزو متن نہیں ہیں لطف یہ ہے کہ یہی روایت احتجاج کی جس میں امیر المؤمنینؑ والے قرآن کے تاویل و تنزیل دونوں پر مشتمل ہونے کا تذکرہ ہے اُن اشخاص کا مایۂ ناز مستند ہے جو شیعوں کے عقیدۂ تحریف کو رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں حالانکہ جب اس سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ امیرالمؤمنینؑ کا قرآن متون الفاظ قرآن کے ساتھ تاویل و تفسیر کے اوپر بھی مشتمل تھا تو اس کی ذمہ داری کیا ہے کہ اُس میں جس قسم کے نقص و تغیر کا پتہ دیا گیا ہے وُہ اصلی الفاظ قرآن سے تعلق رکھتا ہے؟ اور پھر جب کہ اُس میں دُوسرے الفاظ بھی اسی کے مؤید موجود ہیں۔

درحقیقت روایت مذکورہ سے قطعی طور پر جو کچھ نکلتا ہے وُہ دو چیزیں ہیں۔

ایک تحریف معنوی یعنی معانی و تاویلات قرآن میں تغیر و تبدیل جو مختلف آیاتِ قرآن

میں ہمیشہ کی گئی اور کی جاتی ہے اور دُوسرے ترتیب قرآن کا بگڑنا یعنی ایک جگہ کی آیت کا دوسری جگہ ہونا چنانچہ ہم مخصوص طور پر اُن فقرات کی شرح درج کرتے ہیں جنھیں مخالف حلقوں کی جانب سے بطور دلیل پیش کیا جاتا رہا ہے۔

**پہلا فقرہ** ثم دفعهم الاضطرار بورود المسائل عنا لا يعلمون تاويله الى جمعه وتاليفه وتضمينه من تلقائهم ما يقيمون به دعائم كفرهم فصرخ مناديهم من كان عنده شيء من القرآن فليأتنا به ووكلوا تاليفه ونظمه الى بعض من وافقهم الى معاداة اولياء الله فالفه على اختيارهم

"پھر (امیر المؤمنینؑ کے ترتیب دادہ قرآن کے واپس کرنے کے بعد) جب ایسے آیات کے متعلق سوالات پیدا ہوئے جن کی تاویل سے وُہ واقف نہ تھے تو اُن کو ضرورت پڑی کہ اُس کی جمع و تالیف کریں اور اُس کو اپنے دِل سے ایسے معانی کا جامہ پہنائیں جن کے ذریعے سے اُن کی حق پوشی کے ستون قائم ہوتے ہیں اُس وقت اُن کے منادی نے آواز دی کہ جس کے پاس کوئی حصہ بھی قرآن کا ہو وہ لے کر ہمارے پاس آئے اور اُس کی تالیف و ترتیب کو بعض ایسے اشخاص کے سپرد کیا جو دوستانِ خدا (اہلبیتؑ) کی مخالفت میں اُن کے موافق تھے اور انھوں نے اُس کو اپنی صوابدید کے مطابق مرتب کیا۔"

الفاظ قرآن کے حذف و اسقاط اور تغیر و تبدیل کے ساتھ تاویل سے ناواقفیت کو کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ مذکورہ بالا عبارت میں اُس کاوش و کاوش کا سبب غیر معلوم التاویل آیات کے متعلق سوال پیدا ہونے کو قرار دیا گیا ہے لہذا یقیناً تضمینه من تلقائهم ما يقيمون به دعائم كفرهم کے معنی وہی ہیں جن کو ہم نے ترجمہ میں ملحوظ رکھا ہے یعنے تضمینہ کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے جو الفاظ کے قبیل سے ہے اور ما یقیمون کے اسم موصول سے معنی مراد ہیں اور مقصود یہ ہے کہ انھوں نے الفاظِ قرآن کو اپنے دِل سے (اگرچہ حقیقتاً وُہ متضمن نہیں ہیں) ایسے ایسے معانی پر متضمن قرار دیا جن سے اُن کی حق پوشی کے ستون محکم ہوتے ہیں۔

اب کوئی بتلائے کہ اس کو الفاظ قرآن میں زیادتی و کمی سے کیا تعلق ہے؟





**دُوسرا فقرہ** ان الكناية عن اسماء ذوى الجرائر العظيمة من المنافقين ليست من فعله تعالى وانها من فعل المغيرين والمبدلين الذين جعلوا القرآن عضين واعتاضوا الدنيا من الدين۔

بڑے بڑے جرم کرنے والے منافقوں کے ناموں کو صرف کنایہ کے طور پر ذکر کرنا خدا کا کام نہیں ہے (کیونکہ اُس نے تو تفسیری حواشی میں اُن کے اسماء کو صاف طور پر ذکر کر دیا تھا) یہ تو اُن تغیر و تبدیل کرنے والوں کا نتیجۂ کار ہے جنھوں نے قرآن کو مبہم بنا دیا اور دُنیا کو دین کے عوض میں حاصل کیا۔

کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ اگر وُہ تفاسیر جو خداوند عالم نے آیاتِ قرآن کے ساتھ بطور خود نازل کئے تھے آج محفوظ ہوتے تو قرآن فہمی کے لیے وُہ روشنی ہاتھ آتی جس کے بعد شک و شبہ کا امکان نہ رہتا۔

**تیسرا فقرہ** والذى بدا فى الكتاب من الازراء على النبى صلى الله عليه وآله من فرية الملحدين۔ "یہ جو کتاب الٰہی کے اندر بادی النظر میں رسالت مآبؐ کے خلاف شان باتیں نظر آتی ہیں یہ صحیح راستہ سے ہٹ جانے والوں کی تراش کا نتیجہ ہیں (کہ انھوں نے صحیح تاویلات کو چھوڑ کر نئے نئے معانی اپنے دل سے تراش لیے۔

**چوتھا فقرہ** واما ظهورك على تناكر قوله فان خفتم الا تقسطوا فى اليتامى فانكحوا ما طاب لكم من النساء وليس يشبه القسط فى اليتامى نكاح النساء فهو مما قدمت ذكره من اسقاط المنافقين من القرآن وبين القول فى اليتامى وبين نكاح النساء من الخطاب والقصص اكثر من ثلث القرآن وهذا وما اشبهه مما ظهرت حوادث المنافقين فيه لاهل النظر والتامل ووجد المعطلون واهل الملل المخالفين للاسلام مساغا الى القدح فى القرآن۔

آیت قرآن " فان خفتم الا تقسطوا فى اليتامى فانكحوا ما طاب لكم" کے متعلق جو اعتراض ہے اس کا منشاء درحقیقت ظاہر دار افراد کا درمیان کی آیتوں کو مٹا دینا

ہے اور یتامیٰ والے فقرہ اور نکاح نسا کے درمیان میں ثلث قرآن سے زیادہ خطاب وقصص وغیرہ تھے اور یہی اور اس کی ایسی دوسری چیزیں وہ ہیں جن میں ان لوگوں کی کارستانی اہل نظر وفکر کو معلوم ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے مخالفین اسلام کو قرآن مجید پر اعتراض کا موقع ملتا ہے اب بتلاؤ کہ متفرق پرزوں اور پتھر کے ٹکڑوں میں سے اگر دو فقرے ایسے ملے جن میں سے درحقیقت ایک اول قرآن کا اور ایک آخر قرآن کا تھا لیکن ناواقفیت کی جہت سے اُن کو ملا کر درج کر دیا گیا تو کیا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان دونوں میں پورے تیس پاروں کا فاصلہ تھا اور وہ فاصلہ ان کے درمیان میں سے ساقط کر دیا گیا؟ کیا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تیس پارے اب کہیں ہیں ہی نہیں اور ناقص ہو گئے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ پارے اس کے قبل اور بعد متفرق طور پر درج کئے گئے ہیں لیکن ترتیب کی خرابی سے اُن دو آیتوں کا افتراق اتصال سے بدل گیا، پھر امام کا یہ فرمانا کہ ان دونوں آیتوں میں ثلث قرآن سے زیادہ کا فاصلہ تھا اور وہ فاصلہ اب ساقط ہو گیا کیونکر اس امر کی دلیل ہو گا کہ وہ ثلثِ قرآن قرآن کے اندر ہی سے حذف ہو گیا اور اب موجود نہیں ہے بلکہ وہ ممکن ہے کہ دوسرے مقامات پر متفرق طور پر موجود ہو۔ درحقیقت اس فقرہ سے سوائے اختلاف ترتیب کے کوئی نتیجہ نکالا نہیں جا سکتا۔

ترتیب کے اختلاف ہی کی بدولت نقص وزیادتی کا اطلاق بھی قرآن میں صحیح ہو جاتا ہے اس لیے کہ جس مقام کی آیت ہٹا کر دوسرے مقام پر مل جائے گی وہ پہلے مقام سے ناقص اور دوسرے مقام پر زائد ہو گئی اور اس طرح

**پانچواں فقرہ**

بھی حل ہو جاتا ہے کہ زادوا فیہ ما ظہرت تناکرہ وتنافرہ "اس میں (موقع بموقع) ایسے جملہ زیادہ ہو گئے جن کی اجنبیت (اُس مقام سے جہاں وہ بڑھائے گئے ہیں) اور مغایرت (اُسی مقام سے) ظاہر ہے۔

ان تشریحات کے ساتھ ہمیں اس روایت کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے قرآن مجید میں زیادتی کا قول جو ظاہر بین افراد کو اس روایت سے سمجھ میں آتا ہے وہ سلف وخلف کے متفقہ اقوال اور اجماع امامیہ کے خلاف ہے اور یہی اُس روایت کے ناقابل اعتبار سمجھے جانے کا کافی مستند ہے اور پھر درصورتیکہ اُس کی کوئی اطمینان بخش کسی غیر اطمینان بخش





سند بھی نہیں ہے یعنے علامۂ طبرسی نے اُس کو بغیر کسی اسناد کے مرسل طور پر نقل کیا ہے۔

رہ گیا اُن کا دیباچہ میں یہ کہہ دینا کہ میں اُن روایات کو نقل کروں گا جو میری نظر میں مستند اور قابل وثوق ہیں یہ کسی صورت سے اس روایت کے اعتبار کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اُن کی نظر میں کسی روایت کا قابل اعتبار ہونا اُس کو محققانہ میزان پر قابل اعتبار نہ بنائے گا ورنہ تحقیق رجال اور علم درایت وروایت کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا اور علماء کے روایات تحقیق رجال سے مستغنی سمجھے جاتے حالانکہ تحقیق شیوہ علمائے شیعہ نے تو اصُول کافی کے احادیث کو بھی جرح وتعدیل کے موازنہ سے بلند نہیں قرار دیا ہے اور وہ اس کی روایت کو بھی بغیر تحقیق قبول نہیں کر لیتے پھر احتجاج طبرسی کی روایت کا جو بغیر کسی سند کے ہو کیا وزن سمجھا جا سکتا ہے؟

**چوتھی قسم**

وہ روایات جن میں اجمالی طور سے تحریف کا پتہ دیا گیا ہے لیکن تحریف کی نوعیت اُن سے ظاہر ہو جاتی ہے جیسے احتجاج کی روایت جو ابوذر غفاریؓ سے منقول ہے اُن کا بیان ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کے انتقال کے بعد امیر المومنینؑ نے قرآن جمع کیا اور مہاجرین وانصار کے مجمع میں لا کر پیش کیا۔

فلما فتحه ابوبكر خرج في صفحة فتحها فضائح القوم فوثب عمر وقال يا علي اردده فلا حاجة لنا فيه فاخذه علي عليه السلام وانصرف ثم احضر زيد بن ثابت وكان قاريا للقرآن فقال له عمر ان عليا جاءنا بالقرآن وفيه فضائح المهاجرين والانصار وقد رأينا ان نؤلف القرآن ونسقط منه ما كان فضيحة وهتكا للمهاجرين والانصار فاجابه زيد الى ذلك۔

حضرت ابوبکر نے جو اُس کو کھولا تو سب سے پہلے وہی مقام نکلا جہاں فضائح قوم مذکور تھے بس حضرت عمر نے آگے بڑھ کر کہا یا علیؑ اس کو آپ واپس لے جائیے ہم کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سُن کر حضرت علیؑ نے اس کو لے لیا اور واپس گئے۔ پھر حضرت ابوبکر نے زید بن ثابت کو بلوایا اور حضرت عمر نے اُن سے کہا کہ علیؑ ہمارے پاس قرآن لائے تھے جس میں بہت سے مہاجرین وانصار کی نسبت رسوا کن باتیں ہیں۔ اب ہماری رائے قائم ہوئی ہے کہ ہم خود قرآن کو جمع کریں

اور اُس میں جو کچھ مہاجرین و انصار کے معائب ہوں۔ اُن کو حذف کر دیں۔ زید نے اُن کے حکم کو منظور کیا۔

(۲) عن العیاشی عن الصادق علیہ السلام لو قرأ القرآن کما انزل لا لفیتمونا فیہ مسمّین "اگر قرآن اُس طرح پڑھا جاتا جس طرح نازل ہُوا تھا تو ہمارے اسماء اُس میں مذکور پاتے۔"

(۳) عن النعمانی عن امیر المؤمنین علیہ السلام کانی بالعجم فساطیطھم فی مسجد الکوفۃ یعلمون الناس القرآن کما انزل قلت یا امیر المؤمنین الیس ھو کما انزل فقال لا محی منہ سبعون من قریش۔

"نعمانی نے امیر المؤمنینؑ سے نقل کیا ہے کہ گویا میں (زمانہ حضرت حجت میں) عجموں کے خیمے مسجد کوفہ میں دیکھ رہا ہوں کہ وُہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم اُس صورت پر دے رہے ہیں جس طرح وُہ نازل ہُوا تھا۔ راوی نے عرض کیا یا امیر المؤمنینؑ کیا وُہ صُورت نزول پر نہیں ہے۔ فرمایا نہیں اُس میں سے ستر آدمیوں کے قریش میں سے نام نکال ڈالے گئے۔"

اور اسی قبیل کے روایات جن میں اکثر مراسیل اور ضعاف ہیں لیکن تعدد و تکثر کی بناء پر اُن کے اجمالی مفاد کا ثابت ہو جانا بعید نہیں ہے کہ کہیں کہیں پر سے ایسے اسماء و تصریحات جو سیاستِ وقت کے خلاف تھے حذف و اسقاط کی نذر ہُوئے۔ لیکن ان روایات میں بھی اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وُہ تصریحات متنِ قرآن کا جزو تھے بلکہ یہ توجیہ کہ وُہ تصریحات معنائے تنزیلی کے قبیل سے تھے ان روایات میں بھی کافی گنجائش رکھتی ہے۔

## علماء میں اتفاق و اختلاف

قرآن مجید کے متعلق دو جزو ایسے ہیں جو علمائے شیعہ میں نقطۂ اتفاق ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید میں زیادتی نہیں ہوئی ہے اور موجودہ قرآن کلام الٰہی اور وحی آسمانی ہے۔ دُوسرے یہ کہ قرآن کی ترتیب اصلی سلسلۂ نزول کے مطابق نہیں ہے اور اُس میں تقدیم و تاخیر ہُوئی ہے




لیکن اُس کے بعد کسی اور قسم کی تحریف کے متعلق علماء کا نقطۂ خیال مختلف ہو گیا ہے۔

بہت سے بڑے علماء اور رؤسائے ملت تحریف کے بالکل منکر ہیں اور قرآنِ موجود میں کسی جزو کے بھی اسقاط اور تغیر و تبدیل کو تسلیم نہیں کرتے جن میں سے بعض اکابر کے اسماء درج ذیل ہیں۔

(۱) حافظ الاخبار شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی علیہ الرحمۃ اپنے اعتقادات میں تحریر فرماتے ہیں۔

اعتقادنا ان القرآن الذی انزلہ اللہ تعالیٰ علیٰ نبیہ محمد صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم ھو ما بین الدفتین وھو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذٰلک ومن نسب الینا انا نقول انہ اکثر من ذٰلک فھو کاذب۔

"ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جس کو خدا نے اپنے نبی محمدؐ پر نازل کیا تھا وُہ یہی ہے کہ جو موجود اور لوگوں کے ہاتھ میں متداول ہے اور وُہ اس سے زیادہ نہ تھا.... اور جو شخص ہماری طرف یہ نسبت دے کہ ہم قرآن کو موجودہ مقدار سے زیادہ کہتے ہیں وُہ غلط گو ہے۔"

(۲) سید مرتضیٰ علم الہدیٰ علیہ الرحمہ نے مسائل طرابلسیہ میں تحریفِ قرآن کا انکار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تحریفِ قرآن کا قول ایک جماعت کی طرف ناقلین حدیث میں سے منسوب ہے جنھوں نے اخبارِ ضعیفہ نقل کر کے خیال کیا ہے کہ وُہ صحیح ہیں لیکن یہ اخبار اُن یقینی و غیر مشکوک وجوہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو ہمارے قول کی صحت کو بتلاتے ہیں۔

(۳) شیخ الطائفہ محمد بن الحسن طوسی اپنی عظیم الشان تفسیر تبیان میں تحریر فرماتے ہیں۔

اما الکلام فی زیادتہ ونقصانہ یعنی القرآن فمما لا یلیق بہ لان الزیادۃ فیہ مجمع علی بطلانہ والنقصان منہ فالظاھر ایضاً من مذھب المسلمین خلافہ وھو الالیق بالصحیح من مذھبنا کما نصرہ المرتضیٰ وھو الظاھر من الروایات۔

قرآن مجید کے متعلق زیادتی و نقصان کی بات کا زبان سے نکالنا مناسب نہیں ہے اس لیے کہ زیادتی کے تو بطلان پر اجماع ہے اور نقصان کے متعلق بھی عام مسلمانوں کے مذہب کا ظاہر

یہی ہے کہ نقصان نہیں ہُوا ہے اور ہماری جماعت شیعہ کا بھی صحیح مذہب یہی کہا جا سکتا ہے جس کو سید مرتضیٰؒ نے تقویت دی ہے اور وُہ ائمہؑ کے روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

(۴) امین الاسلام شیخ ابوعلی طبرسی تفسیر مجمع البیان میں لکھتے ہیں۔

اما الزیادة فیہ فمجمع علی بطلانہ واما النقصان فیہ فقد روی جماعۃ من اصحابنا وقوم من حشویۃ العامۃ ان فی القرآن تغییرا ونقصانا والصحیح من مذہب اصحابنا خلافہ وھو الذی نصرہ المرتضیٰ قدس اللہ روحہ۔

"قرآن میں زیادتی کا ہونا تو باجماع باطل ہے اور کمی کے متعلق کچھ شیعہ و سُنّی محدثین نے روایات نقل کر دیئے ہیں کہ اس قرآن میں کچھ تغییر و تبدیل اور نقصان ہُوا ہے لیکن ہمارے علماء میں جو صحیح مذہب ہے وُہ اس کے خلاف ہے اور یہی وُہ ہے جس کو سید مرتضیٰؒ نے ثابت کیا ہے۔"

(۵) فاضل تونی ملا عبداللہ بشروی خراسانی شرح وافیہ مطبوعہ لکھنؤ ص۵۲-۵۳ میں لکھتے ہیں قد وقع الخلاف فی تغییرہ فقیل ان فیہ زیادۃ ونقصانا وبہ روایات کثیرۃ رواھا الکلینی وعلی بن ابراھیم فی تفسیرہ والمشھور انہ محفوظ و مضبوط کما انزل لم یتبدل ولم یتغیر حفظہ الحکیم الخبیر۔

"قرآن مجید میں تغییر و تبدیل واقع ہونے کے متعلق اختلاف ہُوا ہے بعض نے کہا ہے کہ اُس میں کچھ الفاظ کی کمی زیادتی ہُوئی ہے اور اس کے متعلق بہت سی روایتیں بھی وارد ہُوئی ہیں جن کو کلینی و علی بن ابراہیم نے درج کیا ہے لیکن مشہور بین العلماء یہ ہے کہ وُہ جتنا نازل ہوا تھا اتنا ہی محفوظ و مضبوط ہے اور اُس میں تغییر و تبدیل نہیں ہُوئی خدا نے اُس کی حفاظت فرمائی ہے۔"

(۶) علامہ محمد حسن آشتیانیؒ بحر الفوائد فی شرح الفرائد مطبوعہ ایران ص۹۹ میں لکھتے ہیں

المشھور بین المجتھدین والاصولیین بل اکثر المحدثین عدم وقوع التغییر مطلقا بل ادعی غیر واحد الاجماع علی ذلک سیما بالنسبۃ الی الزیادۃ۔

"قول مشہور مجتہدین اور اصولیین بلکہ اکثر محدثین کے درمیان میں بھی یہی ہے کہ قرآن





میں تغییر و تبدیل بالکل نہیں ہُوئی ہے بلکہ متعدد حضرات نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے خصوصاً زیادتی کے متعلق۔"

اس کے بعد طرفین کے ادلہ نقل کرنے کے بعد خود محاکمہ فرماتے ہُوئے لکھا ہے۔

الاخبار الدالۃ بظاھرھا علی حدوث التغییر وان کانت کثیرۃ الا ان اکثرھا الا ما شذ ضعیفۃ السند ویمکن دعوی تواترھا فلا یقدح ضعف السند فیھا لکن الانصاف عدم نصوصیتھا فیما ذکرہ الاخباریون وقوۃ احتمال ارادۃ ما عرفتہ من وجوہ المعانی فیھا۔

"وُہ اخبار جو ظاہری طور پر تغییر کے وقوع کو بتلاتے ہیں وُہ بہت ہیں مگر وُہ سوائے شاذ و نادر کے اکثر ضعیف السند ہیں۔ ہاں اُن کے تواتر کا ادعا کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ضعف سند میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ وُہ اخباریین کے قول کو صریحی طور پر بتلاتے بھی نہیں اور احتمال قوی ہے کہ اُن سے مُراد وہی معانی ہوں جو اُن اخبار کی تاویل میں ذکر کئے گئے ہیں۔"

یہ تو وُہ عبارات ہیں جو بحالت موجودہ ہمارے پیشِ نظر ہیں اس کے علاوہ شیخ مفید علیہ الرحمہ نے کتاب المقالات میں لکھا ہے۔

قد قال جماعۃ من اہل الامامۃ انہ لم ینقص من کلمۃ ولا من آیۃ ولا من سورۃ۔

"ایک جماعت نے امامیہ میں سے کہا ہے کہ قرآن میں سے کوئی سورہ کوئی آیت بلکہ کوئی کلمہ بھی کم نہیں ہُوا ہے۔" سید محسن اعرجیؒ نے شرح وافیہ میں اور شیخ فتح اللہ کاشانیؒ نے تفسیر منہج الصادقین میں بھی اس خیال پر زور دیا ہے۔

ان حضرات کے خلاف کچھ علماء جن میں اکثر اخباریین اور بعض اصولیین داخل ہیں۔ مذکورۂ سابق روایات کی بناء پر اس امر کے قائل ہو گئے ہیں کہ قرآن میں کمی واقع ہُوئی ہے اور محدث نوری نے تو اس موضوع پر مستقل کتاب لکھ دی ہے جس کا نام "فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب" ہے لیکن اس کتاب کو عام طور پر علمائے شیعہ نے نظرِ قبول سے نہیں

دیکھا تھا چنانچہ آقا محمد مہدی موسوی کاظمی اپنی کتاب "احسن الودیعہ فی تراجم علماء الشیعہ" مطبوعہ بغداد ص۹۰ میں محدث نوری کے حالات اور اُن کے مصنفات کی فہرست لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب طبع فی ایران علی الحجر بقطع امالی شیخنا الطوسی ولیتہ ما الفہ وقد کتب فی ردہ بعض العلماء رسالۃ شریفۃ بیّن فیہا ما ھو الحق وشنّع علی المحدث النوری علماء زمانہ۔

"فصل الخطاب در اثبات تحریف کتاب ایران میں امالی شیخ طوسیؒ کی تقطیع پر طبع ہوئی ہے اور کاش اُنھوں نے یہ کتاب نہ لکھی ہوتی اور اُسی زمانہ میں بعض علماء نے اُس کی رد میں ایک رسالۂ شریفہ تصنیف کیا تھا جس میں اس مسئلہ میں جو قول حق ہے اُس کو واضح کیا تھا اور محدث نوری پر اس کتاب کی وجہ سے اُن کے زمانہ کے علماء نے طعن وتشنیع کی۔"

اس صورتِ حال کے بعد فرقۂ شیعہ کی طرف متفقہ حیثیت سے یہ نسبت دینا کہ وُہ تحریف قرآن کا قائل ہے غلط ہے۔

## قائلینِ تحریف کا ایمان بالقرآن

عام طور پر اس خیال کی نشرو اشاعت کی جاتی ہے کہ تحریفِ قرآن کا عقیدہ ایمان بالقرآن کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اس لیے کہ جس کتاب میں تغیر وتبدیل اور حذف واسقاط عمل میں آگیا ہو وُہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہو گئی اور یہ حق باقی نہیں رہا کہ اُس پر ایمان کا دعویٰ کیا جائے لیکن یہ خیال حقائق مذہب اور احکام عقل سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

ہم نے "معیار حجیت یا سند اعتبار" کے تحت میں اس امر کی کافی توضیح کر دی ہے کہ تحریف کا اجمالی ثبوت جس کے اندر مخصوص موارد اور خاص نوعیت کی تعیین نہ ہو بے شک تمام کتاب کو غیر معتبر بنانے کا سبب ہو سکتا ہے لیکن تحریف کا ثبوت اس طرح کہ اُس کے مقامات کی تعیین اور نوعیت کا علم ہو جائے موجودہ حصّہ کے اعتبار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا





جبکہ موجودہ حصّہ کے متعلق قطعی دلائل بھی موجود ہوں جو اُس کے حجیت واعتبار کے ضامن ہیں۔

علمائے شیعہ میں سے وُہ افراد جو مذکورہ سابق روایات کے ظاہری مفاد کی بناء پر موجودہ قرآن میں نقصان وتحریف کے قائل ہو گئے ہیں اُن کے عقیدۂ تحریف کی نوعیت یہی ہے۔

گذشتہ روایات کو اُن تمام اقسام کے ساتھ جنھیں ہم نے ترتیب وار پیش کیا ہے اگر اسی اعتبار سے دیکھا جائے کہ اُن میں تحریفِ قرآن کا اظہار کیا گیا ہے تو اُن سے ثبوتِ تحریف کا اجمال ایک محدود دائرہ کی تفصیل پر منطبق ہو جاتا ہے جس کے بعد قرآن مجید پر عمل اور اُس سے احکامِ شرعیہ کے استفادہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ایک قسم کے روایات کا یہ مفاد کہ تحریف ہوئی ہے اور دُوسری قسم میں اس کی تشریح کہ یہاں یہ نام تھا وُہ ساقط ہُوا اور وہاں وُہ نام تھا وُہ حذف ہو گیا اور پھر تیسری قسم میں نوعیتِ تحریف کا بیان کہ اُس سے وُہ جو اہلبیتؑ کی خلافت اور اُن کے معاندین کی مخالفت میں صراحتیں تھیں جاتی رہی ہیں اس سب کا مجموعہ موجودہ اجزائے قرآن اور اُن سے مستفاد شدہ احکامِ شرعیہ کی حقانیت وصداقت کو اس تحریف کی زد سے الگ کر دیتا ہے۔

اب ذرا انصاف کی آنکھیں کھول کر دیکھو کہ تحریف کے متعلق دو قسم کی روایتیں ہیں۔

ایک وُہ جو اجمالی طور پر قرآن کے اندر تغیر وتحریف کا پتہ دیتی ہیں۔ دوسری وُہ جو تحریف کے موارد کو معیّن اور اُس کی نوعیت کو واضح کر دیتی ہیں۔

پہلی قسم کی روایتیں اگر تنہا ہوں تو قرآن کے ہر ہر جزو کو مشکوک بنا دیتی ہیں لیکن دُوسری قسم کے روایات کا ضمیمہ بڑے حصّہ کو قرآن کے تحریف سے علیحدہ کر دیتا ہے۔

پہلی قسم کے روایات سنی وشیعہ دونوں کی کتابوں میں مذکور ہیں اور اہل سنت کے جوامع حدیث میں نمایاں طور پر اُنھیں جگہ دی گئی ہے جس کی تصدیق کے لیے اگر چاہو تو اسی کتاب کے وسطی حصّہ کا چند ورق الٹ کر دوبارہ مطالعہ کر لو۔

لیکن دوسری قسم کے روایات کتب شیعہ سے مخصوص ہیں اور اُن کا پتہ اہل سنت کے جوامع حدیث میں نہیں ہے۔ اب بتلاؤ کہ قرآن کے سند واعتبار کی حفاظت کس فریق نے کی اور ایمان بالقرآن کا دعویٰ کس کو زیادہ زیب ہے۔

درحقیقت شیعوں نے رسولؐ کے بعد ایک معصوم کے وجود کو تسلیم کرکے اپنے لیے یقینی طور پر مذہب و تعلیمات مذہب پر کاربند ہونے کا اور حقائق ایمان پر اعتقاد رکھنے کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور انہی ائمہ معصومین علیہم السلام کے بیانات وُہ ہیں جو قرآن مجید کے متعلق ہر تاریک پردہ کو چاک کرکے اپنے برق پر تو ہدایات کا چراغ روشن کیے ہُوئے ہیں۔

# قرآن مجید کے حجیت و اعتبار کی قطعی دلیل

## ائمہ اہلبیت علیہم السّلام کے متفقہ اقوال

علمائے شیعہ و حفاظ ملت کے مستند کتب احادیث و جوامع اخبار میں ایسے احادیث کا بڑا ذخیرہ ہے جن سے موجودہ قرآن مجید کا اعتبار و استناد اور اُس کے کلام الٰہی ہونے کا اعتقاد اور اس پر عمل کا واجب و لازم ہونا یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے لیکن اگر ہم اُن تمام احادیث کو درج کرنا چاہیں تو ہمارا یہ رسالہ ایک مبسوط کتاب کی شکل اختیار کرے گا جس کے لیے ابھی وقت و فرصت کی کمی اجازت نہیں دیتی اور پھر جب کہ ہمارا رسالہ موجودہ حالت ہی میں اُس مقدار سے آگے بڑھ گیا ہے جس کا ہمارے دل میں قبل سے ارادہ تھا، لہٰذا ہم اس باب کو اُسی حد تک کہ جس کی بہت زیادہ ضرورت محسوس ہوگی وسعت دے کر ختم کر دیں گے اور ناظرین کو بقیہ نظائر و امثال کے لیے کتب احادیث کے تتبع کی دعوت دیں گے۔

## موجودہ قرآن کے متعلق حقیقی جامع قرآن امیرالمومنینؑ کے اقوال

(۱) نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۲۱

کتاب اللہ بین اظھرکم ناطق لا یعیی لسانہ وبیت لا تھدم ارکانہ وعز لا تھزم اعوانہ۔

"کتاب الٰہی تمہارے اندر موجود ہے۔ وُہ ایسا خطیب ہے جس کی زبان تھکنے والی نہیں





اور ایسا قلعہ محکم ہے جس کے ستون منہدم ہونے والے نہیں اور ایسا نقطۂ عزت ہے جس کے طرفدار شکست کھانے والے نہیں۔"

(۲) ص ۳۰۲

علیکم بکتاب اللہ فانہ الحبل المتین والنور المبین والشفاء النافع والری الناقع والعصمۃ للمتمسک والنجاۃ للمتعلق لا یعوج فیقام ولا یزیغ فیستعتب ولا تخلقہ کثرۃ الرد وولوج السمع من قال بہ صدق ومن عمل بہ سبق۔

دیکھو کتاب خدا (قرآن) پر عمل کرتے رہو اس لیے کہ یہ (خدا کی) ریسمان محکم اور ضیائے روشن اور امراض نفس کا فائدہ پہنچانے والا درمان اور تشنگان ہدایت کی سیرابی کا سامان اور دامن تھامنے والے کے لیے بہترین محافظ اور وابستہ ہونے والے کے لیے نجات کا ذریعہ ہے وُہ کبھی کج ہونے والا نہیں کہ اُس کو سیدھا کرنے کی ضرورت ہو اور نہ وُہ صحیح راستہ سے مُڑنے والا ہے کہ اسے پلٹانے کا موقع پیش آئے۔ بار بار پڑھنا اور کانوں میں گوش زد ہونا اس کو کہنہ نہیں کرتا جو اُس کے موافق بات کہے وُہ سچا ہے اور جو اُس پر عمل کرے وُہ کامیاب ہے۔

(۳) ص ۲۲۴

اعلموا ان ھذا القرآن ھو الناصح الذی لا یغش والھادی الذی لا یضل والمحدث الذی لا یکذب ما جالس ھذا القرآن احد الا قام عنہ بزیادۃ او نقصان زیادۃ فی ھدی او نقصان من عمی واعلموا انہ لیس علی احد بعد القرآن من فاقۃ ولا لاحد قبل القرآن من غنی فاستشفوہ من ادوائکم واستعینوا بہ علی لاوائکم فان فیہ شفاء من اکبر الداء وھو الکفر والنفاق والغی والضلال فاسألوا اللہ بہ وتوجھوا الیہ بحبہ ولا تسألوا بہ خلقہ انہ ما توجہ العباد الی اللہ بمثلہ واعلموا انہ شافع مشفع وقائل مصدق وانہ من شفع لہ القرآن یوم القیامۃ شفع فیہ ومن محل بہ القرآن

يوم القيامة صدق عليه فانه ينادي مناد يوم القيٰمة الا ان كل حارث مبتلى في حرثه وعاقبة عمله غير حرثة القرآن فكونوا من حرثته واتباعه واستدلوه على ربكم واستنصحوه على انفسكم واتهموا عليه اراءكم واستغشوا فيه اهواءكم

یقین جانو کہ یہ قرآن وُہ ناصح ہے جو دھوکا نہ دے اور وُہ راہنما ہے جو کبھی گمراہ نہ کرے اور وُہ بات کرنے والا ہے جو کبھی جھوٹ نہ بولے، کوئی اس قرآن کا ہمدم نہیں بنا۔ مگر یہ کہ اس میں زیادتی پیدا ہوئی یا کمی، زیادتی ہدایت میں اور کمی ضلالت میں اور یقین جانو کہ قرآن کے ہمراہ کسی کو احتیاج باقی نہیں رہ سکتی اور قرآن کے بغیر استغنا ناممکن۔ اس کو تم اپنے امراض کے لیے ذریعہ شفا اور اپنی مصیبت کے وقت پر مددگار قرار دو اس لیے کہ اس میں سب سے بڑے مرض کی شفا موجود ہے جس کا نام ہے کفر اور نفاق اور کور باطنی اور گمراہی، خُدا سے اس قرآن کے ذریعے سے سوال کرو اور اسی کی محبت کے ساتھ اُس کی بارگاہ کی طرف رُخ کرو لیکن اس قرآن کو مخلوق کے پاس رشوت ستانی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ بے شک خدا کی بارگاہ میں اس سے بڑھ کر کوئی وسیلہ نہیں یقین جانو کہ یہ قرآن شفاعت کرنے والا اور اس کی شفاعت قبول کی جانے والی ہے جس کی سفارش روزِ قیامت قرآن کرے گا تو وُہ قبول ہوگی، جس کی قرآن شکایت کرے گا تو (اُس کے خلاف) اس کی شکایت مسموع ہوگی۔ روزِ قیامت آواز دی جائے گی کہ ہر کاشتکار آج اپنی کشت کے حساب میں مبتلا ہوگا سوا اس شخص کے جس نے کشتِ قرآن کو سرسبز کیا ہو۔ پھر کیوں نہ تم سب لوگ کشتِ قرآن کے کارندے اور اتباع ہو جاؤ اور اس قرآن کو اپنے رب کی جانب اپنا رہنما قرار دو اور اپنے نفسوں کے خلاف اُس کی نصیحتوں کو قبول کرو اور اس کے مطالب میں خود اپنے ذاتی خیالات پر بے اعتمادی کرو اور اپنے خواہشات نفس کو خود فریبی سمجھو۔

(۴) صفحہ ۲۸۳

انه سيأتي عليكم من بعدي زمان ليس فيه شيئ اخفى من الحق ولا اظهر من الباطل ولا اكثر من الكذب على الله ورسوله وليس عند اهل ذلك الزمان سلعة ابور من الكتاب اذا تلي حق تلاوته ولا انفق منه اذا حرف عن مواضعه ولا في البلاد شيئ انكر من المعروف ولا اعرف من المنكر فقد نبذ الكتاب حملته وتناساه حفظته فالكتاب يومئذ واهله طريدان منفيان وصاحبان مصطحبان في طريق واحد لا يؤويهما مؤو فالكتاب واهله في ذلك الزمان في الناس وليسا فيهم ومعهم لان الضلالة لا توافق الهدى وان اجتمعا فاجتمع القوم على الفرقة وافترقوا عن الجماعة كانهم ائمة الكتاب وليس الكتاب امامهم فلم يبق عندهم منه الا اسمه ولا يعرفون الا خطه وزبره۔





"یقیناً میرے بعد ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں کوئی شے حق سے زیادہ مخفی اور باطل سے زیادہ ظاہر نہ ہوگی، اُس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی چیز بے قیمت نہ ہو جب اُس کو حق تلاوت ادا کرتے ہُوئے پڑھا جائے (یعنی اُس کے صحیح معانی کے ساتھ اُس کے آیات کو پیش کیا جائے) اور اُسی قرآن سے زیادہ کوئی شے رائج نہ ہوگی جبکہ اُس کو اُس کے مقامات سے ہٹایا جائے (یعنی اس کے معانی میں تراش خراش کر کے اصلی مقاصد سے دُور کر دیا جائے) کوئی شے عالم میں معروف سے زیادہ منکر اور منکر سے زیادہ معروف نہ ہوگی قرآن کو اُس کے حاملین نے پس پشت ڈال دیا ہوگا اور اُس کی حفظ کے دعوے دار افراد نے اُس کو بھلا دیا ہوگا۔ اُس دن قرآن اور حقیقی اہلِ قرآن شہر بدر اور جلا وطن ہوں گے وُہ دونوں ایکدوسرے کے ہم نفس اور ہمدم ہوں گے کہ اُن دونوں کو کوئی پناہ دینے والا نہ ملتا ہوگا۔ قرآن اور اہلِ قرآن اُس وقت لوگوں کے اندر ہوں گے لیکن گویا وُہ اُن کے اندر اور اُن کے ساتھ نہیں ہیں اس لیے کہ ضلالت ہدایت کے موافق نہیں ہو سکتی اگرچہ ایک جگہ پر ہو۔ وُہ لوگ افتراق پر مجتمع اور نقطۂ اجتماع سے متفرق ہوں گے گویا وُہ خود قرآن کے رہنما ہیں (کہ جدھر چاہیں اس کو پھیر لیں) نہ یہ کہ قرآن اُن کا راہنما ہے۔ اُن کے پاس قرآن کا صرف نام باقی ہوگا اور وہ بس اُس کے خط اور حروف کو پہچانتے ہوں گے۔"

اس قسم کے واقعات کا اظہار درحقیقت تحذیر و تخویف کے طور پر کیا جاتا تھا اور غرض یہ تھی کہ لوگ اپنے طرزِ عمل کی نگرانی کرتے ہُوئے اس کو ایسے نتائج تک پہنچنے سے روک سکتے ہیں۔

اس سے یقیناً قرآن مجید پر عمل اور اُس کے اتباع کی اہمیت اور اُس کے صحیح معانی کے فہم میں تدبّر کی ضرورت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس فقرہ سے کہ کتابؐ اہلِ کتاب اس وقت لوگوں کے ساتھ ہوں گے مگر نہیں اس لیے کہ حق و ضلال ایک ساتھ جمع نہیں ہوتے۔" قرآن مجید کی حقانیت و صداقت پر تیز روشنی پڑتی ہے۔

آخری فقرہ کہ لایعرفون الاخطہ وزبرہ، اس امر کی صریحی دلیل ہے کہ تحریف سے مُراد معنوی تراش و خراش ہے ورنہ الفاظ قرآن محفوظ ہوں گے۔

# احادیث کی صحت کا معیار قرآن ہے

ایسے احادیث جوامع حدیث میں اس کثرت سے ہیں کہ جس میں تواتر کا ادعا کیا جاسکتا ہے، جن کا مفاد یہ ہے کہ احادیث کی صحت و عدم صحت کا معیار قرآن مجید ہے ان میں سے پانچ حدیثیں تو اصُول کافی ہی میں مذکور ہیں۔

(۱) علی بن ابراھیم عن ابیہ عن النوفلی عن السکونی عن ابی عبداللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم ان علیٰ کل حق حقیقۃ وعلیٰ کل صواب نورا فما وافق کتاب اللہ فخذوہ وما خالف کتاب اللہ فدعوہ۔

"امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ حضرت رسُولؐ نے ارشاد کیا ہر حق کے لئے حقیقت نما علامات ہیں اور ہر واقعیت کے لئے روشنی ہے تو جو چیز کتاب خدا کے موافق ہو اُس کو لے لو اور جو چیز کتاب خدا کے خلاف ہو اُس کو ترک کردو۔

(۲) محمد بن یحییٰ عن عبداللہ بن محمد عن علی بن الحکم عن ابان بن عثمان عن عبداللہ بن ابی یعفور قال وحدثنی حسین بن ابی العلا انہ حضر ابن ابی یعفور فی ھذا المجلس قال سألت اباعبداللہؑ عن اختلاف الحدیث یرویہ من نثق بہ ومن لانثق بہ قال اذا ورد علیکم حدیث فوجدتم لہ شاھدا من کتاب اللہ عزّوجلّ او من قول رسول اللہؐ والّا فالذی جاءکم اولیٰ بہ۔





"امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے سامنے مختلف احادیث آتے ہیں جن میں سے بعض کے راوی موثق اور بعض کے غیر موثق ہیں اور پھر اُن کے مفاد میں اختلاف ہے (ایسی صُورت میں کیا کرنا چاہیئے) حضرت نے فرمایا جب تمہارے سامنے کوئی حدیث پیش ہو اور اُس کا کوئی شاہد کتاب خدا یا سنّت رسُولؐ سے موجود ہو تو اُس پر عمل کرو، ورنہ جو شخص اُس روایت کو نقل کر رہا ہے وہی اُس پر عمل کا زیادہ مستحق ہے۔

(۳) عدۃ من اصحابنا عن احمد بن محمد بن خالد عن ابیہ عن النضر بن سوید عن یحیی الحلبی عن ایوب بن الحرّ قال سمعت اباعبداللہ یقول کل شئ مردود الی الکتاب والسنۃ وکل حدیث لایوافق کتاب اللہ فھو زخرف۔

"امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ ہر شے کتابؐ سنت کی جانب راجع ہونا ضروری ہے اور جو حدیث کتاب خدا کے موافق نہ ہو وُہ بناوٹی ہے۔

(۴) محمد بن یحییٰ عن احمد بن محمد بن عیسٰی عن ابن فضال عن علی بن عقبۃ عن ایوب راشد عن ابی عبداللہؑ قال مالم یوافق من الحدیث القراٰن فھو زخرف۔

"جو حدیث قرآن کے ساتھ مطابقت نہ رکھتی ہو وُہ بناوٹی ہے۔"

(۵) محمد بن اسمٰعیل عن الفضل بن شاذان عن ابن ابی عمیر عن ھشام بن الحکم وغیرہ عن ابی عبداللہؑ قال خطب النبیؐ بمنیٰ فقال ایھا الناس ما جاءکم یوافق کتاب اللہ فانا قلتہ وما جاءکم یخالف کتاب اللہ فلم اقلہ۔

"امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ رسالت آبؐ نے منیٰ میں خطبہ ارشاد کیا اور اُس میں فرمایا کہ جو حدیث تمہارے سامنے ایسی پیش ہو کہ وُہ کتاب خدا کے ساتھ موافق ہے تو وُہ میرا قول ہوگا اور جو حدیث ایسی آئے کہ وُہ کتاب خدا کے مخالف ہے اُس کو سمجھنا کہ میں نے نہیں کہا ہے۔"

دُوسرے کتب اخبار میں ایسی ہی حدیثیں اس سے زیادہ موجود ہیں اور باوجود اختلاف مفاد کے ان سب کا متفقہ مضمون یہ ہے کہ قرآن احادیث کی جانچ کا معیار ہے اب اگر یہ

قرآن کہ جو مسلمانوں کے ہاتھ میں موجود ہے۔ ائمہ معصومین علیہم السّلام کے نزدیک مصدّق اور تسلیم شدہ نہ ہوتا تو اس کو احادیث کی صحت و عدمِ صحت کا معیار قرار دینا صحیح نہ تھا۔ ان میں سے وُہ احادیث کہ جو جنابِ رسالت مآبؐ سے منقول ہیں اُن کو بھی چونکہ ائمہ اہلِ بیت علیہم السّلام نے معیار بتلاتے ہُوئے نقل کیا ہے اس لیے اُن کی تطبیق بھی اسی قرآن پر ہے کہ جو عام ہاتھوں میں موجود ہے۔

## قرآن کی مخالفت کفر ہے

محمد بن اسمٰعیل عن الفضل بن شاذان عن ابن ابی عمیر عن بعض اصحابہ قال سمعت ابا عبد اللہ علیہ السّلام یقول من خالف کتاب اللہ وسنۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فقد کفر۔

"امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص کتابِ الٰہی اور سنتِ رسالت مآبؐ کی مخالفت کرے وُہ کافر ہے۔

## قرآن نشانِ ہدایت ہے

(۱) محمد بن یحییٰ عن احمد بن محمد عن محمد بن احمد بن یحییٰ عن طلحۃ بن زید عن ابی عبد اللہ قال ان ھذا القرآن فیہ منار الھدیٰ ومصابیح الدجیٰ فلیجل جال بصرہٗ ویفتح للضیاء نظرہ فان التفکر حیٰوۃ قلب البصیر کما یمشی المستنیر فی الظلمات بالنور۔

"امام جعفر صادقؑ نے فرمایا یقیناً یہ قرآن اس میں نشان ہیں ہدایت کے اور چراغ ہیں تاریکیِ ضلالت کے لیے، جس کو منظور ہو وُہ اس سے اپنی بصیرت کو جلا دے اور اس کی روشنی کے لیے آنکھ کھول کر دیکھے کیونکہ غور و فکر کرنا انسان با بصیرت کے دل کے لیے سبب زندگی ہے جس طرح چراغ کی روشنی سے انسان تاریکی میں راستہ قطع کر لیتا ہے۔

(۲) علی بن ابراھیم عن محمد بن عیسیٰ عن یونس عن ابی جمیلۃ قال قال





ابو عبد اللہؑ کان فی وصیۃ امیر المؤمنینؑ اصحابہ اعلموا ان القرآن ھدی النہار ونور اللیل المظلم علیٰ ما کان من جھد وفاقۃ۔

" امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ امیر المؤمنین علیہ السّلام اپنی وصیت میں اصحاب سے فرمایا کرتے تھے یقین جانو کہ یہ قرآن دن کو راہنما اور شبِ تاریک کی روشنی ہے جو سخت ترین ضرورت کے موقع پر کارآمد ہے۔

## قرآن جنّت کا رہنما اور جہنّم سے سدِّ راہ ہے

حمید بن زیاد عن الحسن بن محمد عن وھیب بن حفص عن ابی بصیر قال سمعت ابا عبد اللہ یقول ان القرآن زاجرا وآمرا یأمر بالجنۃ ویزجر عن النار

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ قرآن روکنے والا اور حکم دینے والا ہے، حکم دیتا ہے جنت کی طرف جانے کا اور روکتا ہے آتشِ جہنم میں جانے سے۔

اس کے علاوہ تلاوتِ قرآن کے فضائل، حاملِ قرآن کا درجہ، حفظِ قرآن کا ثواب، تعلیمِ قرآن کی اہمیت، تدبّر فی القرآن کا حکم یہ وُہ ابواب ہیں جن میں احادیث حدِ تواتر تک پہنچے ہُوئے ہیں اور اصُولِ کافی کا آخری حصّہ اُن احادیث سے مملو ہے۔

پھر وُہ مقامات جہاں ائمہ معصومین علیہم السّلام نے احکامِ شرعیہ کے لیے آیاتِ قرآن سے تمسک کر کے علمائے مذہب کو ظواہرِ قرآن سے استفادۂ احکام کا سبق دیا ہے مثلاً عبد الاعلیٰ مولیٰ آلِ سام کے سوال پر کہ اگر انگلی میں زخم ہو اور اُس کو کھول نہ سکتا ہو تو کیا کرے حضرت نے جبیرہ کا حکم دیا اور فرمایا کہ ھذا وامثالہ یعرف من کتاب اللہ تعالیٰ ما جعل علیکم فی الدین من حرج۔

"یہ اور اس کے ایسے دُوسری جو صورتیں ہوں اُن کا حکم تو اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خداوندِ عالم نے تمھارے لیے دین میں عسر و حرج نہیں قرار دیا ہے۔"

یا زرارہ کے سوال پر کہ کہاں سے ثابت ہُوا مسح سر کے بعض حصّہ پر ہے حضرت نے فرمایا لمکان الباء فی قولہ تعالیٰ وامسحوا برؤسکم اس لیے کہ خداوندِ عالم نے وامسحوا

پڑھ سکو فرمایا ہے یہ نہیں کہا کہ اصحوا رڈ سکو۔

ان تمام احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ ائمہ اہلبیت علیہم السلام نے موجودہ قرآن کو تسلیم کرلیا تھا اور وہ اُس کو کتابِ الٰہی اور واجب العمل قرار دیتے تھے۔

اور پھر اواسط زمانۂ بنی عباس میں خصوصًا امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام رضا علیہ السلام کے عہد میں تقیہ کا شکنجہ ایسا تھا جو ائمہ معصومینؑ کی زبان کو اظہار حقائق سے بالکل روکے رہتا۔ لیکن کسی ایک حدیث سے بھی اس کا پتہ نہیں دیا جاسکتا کہ امام نے کبھی کسی صحابی کو اس قرآن پر عمل کرنے سے اور اُس سے احکام کا استفادہ کرنے سے منع کیا ہو یا نماز وغیر نماز میں اس قرآن کے علاوہ کسی قرآن کی تلاوت کی ہدایت کی ہو۔

امام ابوحنیفہ وقتادہ وغیرہ دیگر علمائے وقت کو پوری آزادی کے ساتھ امامؑ نے اپنی رائے پر عمل کرنے اور اپنے اجتہاد کے مطابق فتوٰی دینے سے منع کیا ہے لیکن اس کی وجہ یہی بتلائی گئی کہ تم محکم ومتشابہ ناسخ ومنسوخ تنزیل وتاویل کا علم نہیں رکھتے اور قرآن کے مطالب کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے سینہ بسینہ اس کے معانی ومطالب کو حاصل کیا ہو لیکن کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ یہ قرآن محرف ہے اس لیے اس سے استفادۂ احکام جائز نہیں ہے۔

کیا ان تمام تصریحات اور ادلّہ وشواہد کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوسکتا ہے کہ ائمہ شیعہ سے اس قرآن کے متعلق کوئی تصدیق بھی صادر نہیں ہوئی ہے جو اُس کے کتابِ الٰہی ہونے کی دلیل ہو۔

ائمہ علیہم السلام کے بعد اور زمانہ غیبت میں فقہائے مذہب اور علمائے ملت نے بھی ہر زمانہ اور عصر میں اپنے قول وعمل سے موجودہ قرآن کی مذہبی اہمیت کو محفوظ رکھا۔

دیکھو فقہا کی کتابیں خطِ مصحف کو بغیر طہارت چھونا جائز نہیں، سجدہ والے سُوروں کا جنب وغیرہ کے لیے پڑھنا حرام۔ عام سورہ قرآن کی آیتوں کا پڑھنا اُن کے لیے مکروہ، کافر کی ملکیت قرآن کے لیے ناجائز۔ اگر وہ خرید لے تو مجبور کرنا اُس کو فروخت پر لازم۔ موجودہ قرآن کے علاوہ کسی جزو کو بحیثیت قرآن نماز میں پڑھنا حرام۔ نجاست کا پہنچانا قرآن تک کبیرہ گناہ۔ احادیث میں سے جو قرآن کے بالکل خلاف ہو مسترد۔ تعارض اخبار کے وقت کسی عموم و





اطلاق قرآن کے موافق ہونا وجہ ترجیح اور احکام شرعیہ کے ادلۂ اربعہ میں سے قرآن کا پہلا درجہ اس کے بعد بھی کیا اُن کا ایمان بالقرآن کسی دلیل وبرہان کا محتاج ہے؟

# تمام بحث کا آخری نتیجہ

# یا

# میرا عقیدہ

موجودہ قرآن کلامِ الٰہی وحیِ آسمانی، رسولؐ کا اعجاز اور مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہے اس کے کسی جزو یا کل کے مفاد کی مخالفت مخالفتِ خدا ہے اور اُس کا اتباع ہر مسلمان کا رکن مذہب اور اہم ترین فریضہ ہے۔ موجودہ قرآن کے علاوہ کسی سورہ کسی آیت کسی حرف کا بھی جزوِ قرآن ہونا ثابت نہیں ہے اور نہ اُس پر احکام قرآن مرتب ہوسکتے ہیں۔

واللہ یحق الحق بکلماتہ

لکھنؤ

علی نقی النقوی عفی عنہ
جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ